ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
جنوری ۱۹۸۸ء
اس شمارہ کیساتھ
ایک خوبصورت پاکٹ کلینڈر
مفت حاصل کریں۔

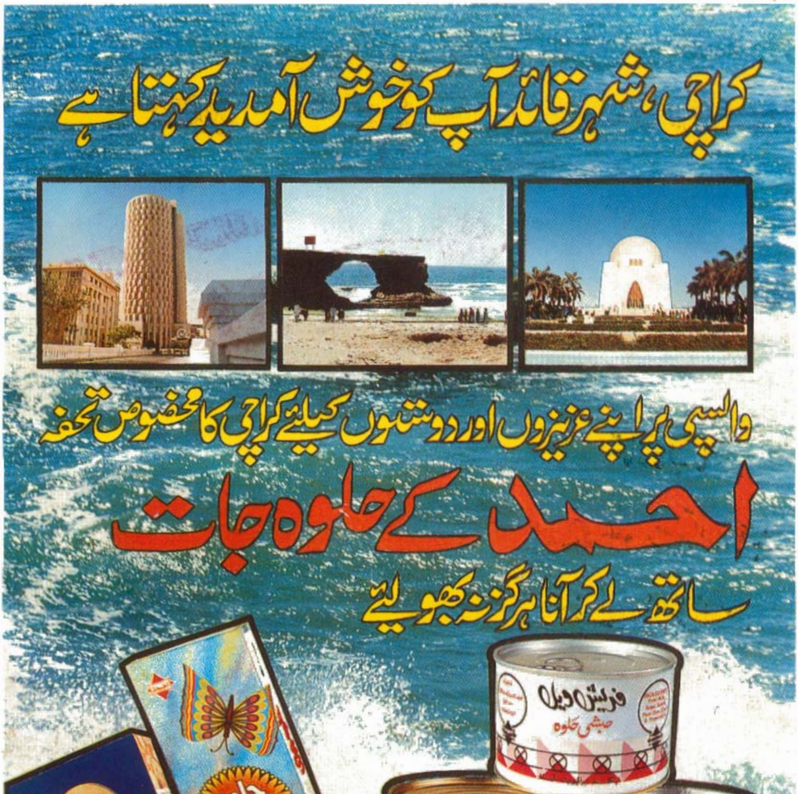

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
فریش ویل
سوہن ڈیلائیٹ
فریش ویل
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
فریش ویل
MASS

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

سرپرست ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

مُدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول تجمل حسین چشتی

مشاورت مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرِ اعزازی طاہر مسعود

مُشیرِ ادارت محمد سلیم مُغل

قانونی مشیر (اعزازی) خواجہ عدیل احمد

ناظمِ اشتہارات طارق ظفر برنی

خطاطی رئیس الحسن، عارف سعید

جلد نمبر ۲

شُمارہ نمبر ۷

جنوری ۱۹۸۸ء

جمادی الاوّل ۱۴۰۸ھ

قیمت ــــــــ پانچ روپے

زرِ سالانہ کے لئے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے!

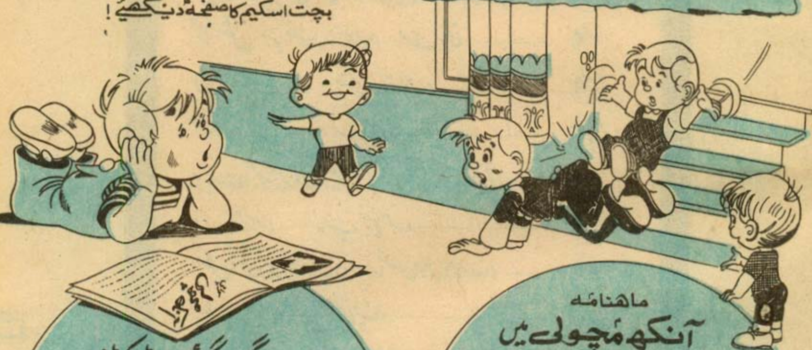

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جُملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

گرین گائیڈ اکیڈمی

ادارہ اِشاعت برائے

تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال

زیرِ سرپرستی

ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ناشر

ظفر محمود شیخ

طابع ـ زاہد علی ، مطبع ـ لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

گرین گائیڈ اکیڈمی

برائے خط و کتابت ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ

و مقامِ اِشاعت سائٹ، کراچی

اداریہ ———— ۵
اچھی بات ———— ۶
حمد ———— امید فاضلی ———— ۷
کہو بچو تمہارا سالِ ماضی کس طرح گزرا (نظم) محمد امان خان دل ۸
ڈاک ڈاک کس کی ڈاک — خطوں کے جوابات ———— ۹
اس ماہ کا نام کیسے پڑا؟ —— محمد اسلم شیخوپوری ———— ۱۱
دریچہ ———— طاہر مسعود ———— ۱۲
عظمت ———— رضیہ بٹ ———— ۱۳
انسانی دماغ، زندہ کمپیوٹر —— شاہنواز فاروقی ———— ۲۵
وہ ایک تاریخی دن ———— سید خورشید عالم ———— ۲۹
۷۲ سانپوں کے درمیان ۷۲ گھنٹے — صباحت شکیل ———— ۳۲
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں — ماہ وش شکیل ———— ۳۶
تلاش (دنیا سلسلے وار ناول) — آصف فرخی ———— ۳۹
لذیذار لطیفے —— (منتخب لطائف) ———— ۴۹
فنگر پرنٹس —— نیر ابدالی ———— ۵۳
یہ بات سمجھ میں آئی نہیں (نظم) احمد حاطب صدیقی ———— ۵۷
بدلہ (ڈرامہ) —— رضیہ نصیح احمد ———— ۵۹
انکل آئی کیو روبوٹ — (سائنسی سوال و جواب) ———— ۶۹
دیوار ———— مصطفیٰ چاند ———— ۷۵
دائرہ معلومات —— ام رباب جعفری ———— ۸۵
گمشدہ جنت —— ابن شہباز خان ———— ۹۱
پناہ (آخری قسط) ———— ۹۹
مشاغل کی کہانی —— عقیل عباس جعفری ———— ۱۰۴
نئی تحریریں ———— بچوں کا شعبہ ———— ۱۱۱
آؤ ملائیں ہاتھ —— (قلمی دوستی) ———— ۱۱۹
امی ابو کا صفحہ ———— ۱۳۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نیا عیسوی سال شروع ہو گیا !!!

یوں تو مسلمان کی حیثیت سے، ہمیں اپنے سال کا آغاز و اختتام اسلامی کیلنڈر کی روشنی میں کرنا چاہیئے، لیکن اب اِسے کیا کہا جائے کہ ہم نے زندگی کے ہر شعبے میں مغربی طور طریقوں کو اپنا رکھا ہے۔ ہمارا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، رہنا سہنا، مِلنے جُلنے کے طریقے، ادب آداب سبھی مغربی طرز کے ہو گئے ہیں۔

ہم فون پہ "السلام علیکم" کہنے کے بجائے "ہیلو" کہتے ہیں۔ اپنی تاریخ پیدائش کے دِن سالگرہ مناتے ہیں اور موم بتّیاں بُجھا کر "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گاتے ہیں۔ چھینک آجائے تو "یرحمک اللہ" کہنے کی جگہ "ایکسکیوز می" کہتے ہیں۔ چھوٹی موٹی غلطی پر "سوری" کہہ کر کام چلا لیتے ہیں۔ کُرتا پاجامہ پہن کر تقریبات میں جاتے ہوئے کسی قدر ہچکچاتے ہیں۔ نوعُمر لڑکے سوٹ اور ٹائی پہن کر خود کو سُرخرو محسوس کرتے ہیں، لیکن شیروانی پہننے کے متعلق سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ چاول بھی چمچے اور کانٹے سے کھاتے ہیں جیسے یہ کیل کانٹے ہاتھ کی انگلیوں سے زیادہ مقدس ہوں۔ اور جب گفتگو کرتے ہیں تو اپنی پیاری زبان میں جا بجا انگریزی الفاظ کی ملاوٹ کر کے اس کا حلیہ اتنا بگاڑ دیتے ہیں کہ یہ نہ اُردو رہتی ہے اور نہ پوری انگریزی۔

اور بعض اوقات تو کچھ خریدتے وقت بھی ہم احتیاطاً دیکھ لیتے ہیں کہ کہیں یہ ہمارے اپنے مُلک کا بنا ہوا تو نہیں ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں اور میزوں پر عیسوی کیلنڈر سجا رہتا ہے اور ہم اپنے مہینے اور سال اسی سے دیکھتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سوں کو اسلامی مہینوں کے شاید پورے نام بھی یاد نہ ہوں۔ جب ہم اپنی زندگی، اپنے عقیدے اور تصوّرات کے مطابق گزارنے کے بجائے مغربی طریقوں سے گزار رہے ہوں، جب ہماری اپنی تہذیب و تمدّن خود ہماری نظروں میں حقیر ہو جائے، تو آپ نے کبھی سوچا ہے کہ غیروں کی نگاہ میں اِس کا کیا مقام ہو گا۔؟

اور یہ اندھی تقلید ہمیں کہاں لے جائے گی؟

آپ کا دوست

اچھی بات

ایک سنگدل تاجر زبردستی لکڑہاروں سے لکڑیاں کم دام میں خریدتا اور جاڑوں میں دُگنے چوگنے دام پر کھلتے پیتے لوگوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا۔ غریب امیر سب اُس کے ظلم سے نالاں تھے۔ ایک دن اسی طرح اُس نے کسی غریب سے لکڑیاں چھین لیں اور جتنے دام ہوتے تھے اُس کے آدھے بھی نہیں دیے۔ غریب چیخنے چلّانے لگا اور بددُعائیں دینے لگا۔ کوئی نیک آدمی پاس سے گزر رہا تھا اُس نے تاجر کو ملامت کی کہ غریبوں کے ساتھ ایسا سلوک اچھا نہیں۔ خدا سے ڈرنا چاہیئے لیکن ظالم نے کچھ پرواہ نہ کی۔ اتفاق سے اُسی رات اُس کے لکڑیوں کے ڈھیر میں آگ لگ گئی اور پھیل کر گھر میں بھی پہنچ گئی۔ تمام مال ومتاع جل کر راکھ ہو گیا۔ وہی نیک آدمی دوسرے دن وہاں سے گزرا تو سُنا تاجر اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا یہ آگ کیسے میرے ہاں لگ گئی۔ نیک مرد بول اُٹھا غریبوں کے دِل کی جلن سے۔

حکایت انوارِ سہیلی

حمد

اُمیدؔ فاضلی

اللہ اللہ اُس کا مقدّر
نام ہے تیرا جس کے لب پر
عشق ہے تیرا عالم عالم
حسُن ہے تیرا منتظر منظر
نُور سے تیری یکتائی کے
ضَو دیتے ہیں ماہ و اختر
یاد سے تیری ذکر سے تیرے
ذہن منوّر ، روح معطّر
دین و دُنیا کفُر و ایماں
تو ہے سب کی رُوح کے اندر
تیرے در کے سائل ٹھہرے
کیسے کیسے پیرِ پیمبر
میرا وظیفہ میرا عقیدہ
اللہُ اکبر اللہُ اکبر

کہو بچّو! تمہارا سالِ ماضی کس طرح گزرا؟

محمد امان خاں دل

اگر پوچھوں گا میں تم سے تو بولو سچ بتاؤ گے؟
نہ بولے سچ تو آئندہ بڑا نقصان اُٹھاؤ گے

کہو بچّو! تمہارا سالِ ماضی کس طرح گزرا؟
نیا کوئی تمہارے ذہن و دِل میں حوصلہ اُبھرا؟

تمھیں تعلیم و تربیت میں کیا خامی نظر آئی؟
کوئی تدبیر کی ہے دُور کرنے کی اگر آئی؟

تمہارے جو فرائض ہیں نبھائے کیا وہی تم نے؟
گزاری کیا کسی مقصد کی خاطر زندگی تم نے؟

چلو آجاؤ ماضی سے نکل کر حال کی جانب
قدم اِس عزم سے رکھتے ہیں اگلے سال کی جانب

کہ اب اِس سال پابندی سے ہم اسکول جائینگے
ہوئیں کوتاہیاں ماضی میں جتنی بُھول جائینگے

اثاثہ وقت کا یہ قیمتی یوں ہی نہ کھوئیں گے
وگرنہ زندگی بھر اپنی کوتاہی پہ روئیں گے

خدایا حوصلہ دے، عزم دے، ہمّت عطا کر دے
ہماری منزلوں کو اب ہمارے زیرِ پا کر دے

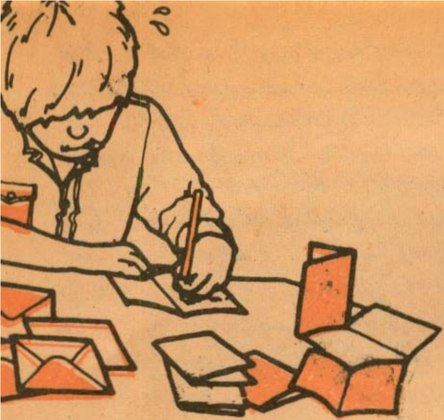

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

اسرار الحق خانزادہ۔ ٹنڈو جام: آنکھ مچولی کے متعلق آپ نے جن محبت بھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے لیے شکریہ۔ یہ سب آپ لوگوں کی ہی محنت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ "گلہری کی دنیا" "چاکلیٹ کی کہانی" اور "گھریلو باغبانی" کے مصنفین تک آپ کی مبارکباد پہنچادی گئی ہے۔ اُمید ہے آئندہ بھی یاد کرتے رہیں گے۔ حسن مہدی خراسانی، فیڈرل بی ایریا کراچی: ہم خیال رکھیں گے کہ نعت کے ساتھ حمد بھی دیا کریں۔ دریچہ "ٹی وی اور ڈیڈی" آپ کو پسند آئے، شکریہ! انکل روبوٹ تک آپ کی گزارش پہنچائی جارہی ہے۔ نئی تحریروں کے صفحات میں جگہ کے حساب سے اکثر اضافہ کر دیا جاتا ہے، خط لکھتے رہا کریں۔ روبینہ احمد۔ لیاقت آباد، کراچی: آپ کیوں چاہتی ہیں کہ ہم اپنی تصویر شائع کرکے بچوں کے حق پر ڈاکہ ڈالیں۔ آپ ہمارے لیے مستقل لکھنا چاہتی ہیں۔ بسم اللہ، یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ امتحان کے بعد ضرور سنجیدگی سے کچھ لکھیں اور ہمیں سنجیدگی سے بھیج دیں۔ ہم اُسے سنجیدگی سے چھاپ دیں گے۔ تنویر اقبال۔ موہری کینال آزاد کشمیر: آپ یقین کریں کہ ہم آپ ہی کی طرح کے قارئین کو (جنھیں آپ نے "ناظرین" لکھا ہے) جواب دیتے ہیں۔ ہمارے محلے میں پکوڑوں اور پان کی دکانیں تو واقعی زیادہ ہیں مگر ان کے پاس آپ کے خطوط نہیں، بلکہ نقل شدہ کہانیاں جاتی ہیں۔ آپ کے اشعار پسند آئے۔ آئندہ بھی لکھتے رہیئے، اشعار نہیں غلط۔ محمد شفیق۔ قصور: آپ بھی دوسرے بہت سے ساتھیوں کی طرح کافی ناراض لگتے ہیں۔ بے شک رسالے پر صرف کراچی والوں کا نہیں، بلکہ پاکستان کے تمام بچوں کا حق ہے۔ محمد ارشد الہدیٰ عادل۔ قصبہ کالونی، کراچی: یہ تو واقعی تشویشناک بات ہے کہ آنکھ مچولی جیسے ہی آپ کے گھر تشریف لاتا ہے، آپ سب بھائیوں میں چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ہے، مگر اس طرح تو آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پرچہ قسطوں میں پہنچتا ہوگا۔ اس کا آسان سا حل تو یہ ہے کہ آپ لوگ اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسالہ باری باری پڑھیں۔ پاسبان اور پناہ کی پسندیدگی کا شکریہ! نئے قسط وار ناول "تلاش" کے متعلق لکھئے کہ آپ کو کیسا لگا! حق اسکواڈ کے مصنف تک آپ کی مبارک باد پہنچادی گئی ہے۔ پرنس وسیم بن اشرف۔ میاں چنوں: ارے آپ ہمیں جن اور بھوت سمجھ رہے ہیں! ایسی کوئی بات نہیں، ہم بھی آپ کی طرح کے انسان ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے مشورے اور تجاویز شاملِ حال رہے تو آنکھ مچولی ہمیشہ بچوں کے سارے پرچوں کا "سردار" رہے گا۔ آپ نے تجمل الیاس کی کہانی "پچھ" کا روزنامہ کا تراشہ بھیجا ہے۔ جس کے مطابق وہ یہ تحریر پہلے بھی شائع کرچکے ہیں، ہماری ان سے اور دیگر تمام ساتھیوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنی پہلے سے شائع شدہ تحریر نہ بھیجیں۔

سفینہ رسول خان۔ میٹھادر، کراچی۔ آپ نے آج تک کسی ادارے کو خط نہیں لکھا، مگر ہمیں تو آپ نے بڑا اچھا خط لکھا ہے، پھر بھی آپ پریشان ہو رہی ہیں کہ خط کس طرح لکھا جاتا ہے، ہاں البتہ کہانی یا مضمون صفحے کے ایک طرف اور لائن چھوڑ کر لکھا کریں۔ ایم رفیق زاہد۔ گوادر بلوچستان: جی ہاں ہم "آنکھ مچولی" اور تمام عملے سمیت بخیریت ہیں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ آپ نے محبت سے خط اور تحریریں بھیجیں، ہم نے محبت سے انھیں اپنے پاس رکھ لیا۔ آپ کی طرح اور بھی بہت سے ساتھی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ دائرۂ معلومات میں کیا انعام دیا جاتا ہے۔ دائرۂ معلومات میں گرین گائیڈ اکیڈمی کی کتابیں اور تازہ شمارہ انعام میں بھیجا جاتا ہے۔ ابن مفرح۔ گجو خان روڈ۔ مردان: آپ ہم سے ناراض ہیں اور کسی سے ناراض نہیں ہونا چاہتے۔ ہم بھی آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ آنکھ مچولی آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ ہم بھی آپ ہی کے ہیں۔ بھلا آپ سے دشمنی کیونکر کرسکتے ہیں؟ "کارنامۂ شہباز" میں کچھ مزا نہیں آیا، کوئی ایسا کارنامہ لکھیں جو واقعی انجام دیا جاسکے اور پڑھنے والے اس سے کچھ سیکھ سکیں۔ راحت صلاح الدین۔ منگھوپیر روڈ۔ کراچی: نومبر کے شمارے میں کوڑے دان اور حق اسکواڈ کی کہانی "مقابلہ" کی پسندیدگی پر ہماری طرف سے شکریہ۔ آپ نے چونکہ پورا پرچہ صرف تین دن میں ہی ختم کر ڈالا۔ اس لیے آپ کو کہانیوں کی تعداد کم محسوس ہوئی۔ آپ روزانہ لکھنے کا موڈ بنایا کیجیے اور ہمارے لیے اچھی اچھی کہانیاں لکھیے۔ بچت اسکیم میں آپ شوق سے شامل ہوں۔ اس میں پہلے شمارے کی قیمت بھی شامل کر دیجئے گا۔ تاکہ آپ کو تازہ شمارے کے ساتھ پہلا شمارہ بھی ارسال کیا جاسکے۔ خطوں کے کالم میں آپ کا نام غلطی سے شائع ہوگیا تھا۔ اُمید ہے، اس وضاحت کے بعد آپ کی اُلجھن دور ہوگئی ہوگی۔ منیر احمد فاضل۔ برڈ وڈ روڈ لاہور: نومبر کے شمارے، خصوصاً "میں تاریکیوں کو منور کروں گا" کی پسندیدگی پر ہماری طرف سے شکریہ قبول کیجیے۔ آپ کی نظم موصول ہوگئی ہے اور شعبہ نظم میں پہنچادی گئی ہے۔

آپ مطمئن رہیئے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ نظم آپ ہی نے "تیار" کی ہے، کسی اور سے تیار نہیں کروائی۔ سعدیہ رفیق ورک۔ بن ایک۔ سیالکوٹ:۔ نومبر کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی آپ کو یوں لگا، جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو اور آپ کی ڈھیروں تعریف و توصیف پڑھ کر ہمیں یوں لگا جیسے ہمارا سیروں خون بڑھ گیا ہو۔ نومبر کے شمارے کی ہر تحریر آپ کو پسند آئی۔ گویا ہماری محنت رنگ لائی۔ بصیر الدین گاہو بھٹی۔ طالب المولیٰ کالونی۔ ہالہ نیو:۔ رسالے میں سائنسی کہانی یا فیچر کے متعلق آپ کی تجویز اچھی ہے۔ اس پر کسی حد تک عمل ہو بھی رہا ہے، پھر بھی آپ کے توجہ دلانے کا شکریہ۔ ہم بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اکثر و بیشتر انعامی مقابلے منعقد کرتے رہتے ہیں، کیا آپ کی نظر سے نہیں گزرے؟ صاعقہ بانو۔ ناظم آباد، کراچی۔ سیرت طیبہ پر آپ کا مضمون موصول ہو گیا ہے۔ آپ اپنی کہانی "کشمکش" کے نام سے قریبی شمارے میں پڑھ سکیں گے۔ طاہر عزیز۔ شاہراہ فیصل۔ کراچی:۔ پرائڈ آف پوزیشن کی سند آپ کو مل گئی۔ شکر ہے خدا کا۔ کہانی "شیطان" کے متعلق آپ نے جو بات لکھی ہے، اس کا ثبوت بھی دیجیئے کیونکہ ثبوت کے بغیر تو یہ محض الزام ہی ہے۔ یاسمین حفیظ۔ بلدیہ ٹاؤن کراچی:۔ آپ کو شکوہ ہے کہ آپ نے جس شدت سے ہمیں خط لکھے، اسی شدت سے ہم نے آپ کو نظر انداز کیا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمیں افسوس ہے۔ آپ کی کہانیاں "بہادری کا انعام" اور "کارنامہ" محفوظ ہیں۔ اور اپنی باری کی منتظر ہیں۔ پرچے پر آپ کے تبصرے اور مزید کہانیوں کا انتظار رہے گا۔ نازنین احسن۔ اٹک کینٹ۔ جی ہاں، ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ آنکھ مچولی کراچی کے علاوہ دوسرے شہروں کے بچے بھی پڑھتے ہیں اور اس پر یقیناً ان کا بھی حق ہے۔ ہمیں سارے شہروں کے ساتھی عزیز ہیں۔ چاہے وہ کراچی کے ہوں یا بیرونِ کراچی کے۔ آپ کی نظم متعلقہ شعبے میں پہنچا دی گئی ہے انتظار فرمایئے۔ ماہین مبشر۔ ناگن چورنگی۔ کراچی:۔ جی ہاں، اس سے پہلے آپ کے خطوط، لطیفے، سوالات اور کہانیاں موصول ہوتی رہیں اور ہم انھیں حفاظت سے رکھتے رہے۔ اب تو ان کا ایک چھوٹا موٹا سا مینار بن گیا ہے۔ سیرت طیبہ پر آپ کا مضمون متعلقہ شعبے کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ اسی شمارے میں پڑھ لیجیئے گا۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کے انکل افسانہ نگار ہیں اور آپ نے ان کو اپنا استاد بنا لیا ہے اب تو آپ کی تحریر چھاپنی ہی پڑے گی فیصل اشفاق۔ مقام نامعلوم:۔ پیارے بھائی! آپ تو بہت ناراض لگتے ہیں۔ شاید اسی ناراضگی میں اپنے شہر کا نام بھی لکھنا بھول گئے۔ زیادہ قیمت کے متعلق آپ کی شکایت بجا ہے۔ سہیل صدیق۔ نعمانیہ روڈ۔ گوجرانوالہ:۔ آپ کی شکایت اپنی جگہ درست ہے کہ آپ کا خط شامل نہیں ہوتا، مگر بات یہ ہے بھائی! کہ ہر ماہ خطوط کا اتنا ڈھیر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا جواب دینا ممکن نہیں ہوتا، بہرحال، ہماری کوشش یہی رہے گی کہ آئندہ آپ کو شکایت نہ ہو۔ سید حبیب علی زیدی۔ شیر شاہ۔ کراچی:۔ آپ نے آنکھ مچولی کے معیار پر جو اعتراض کیا ہے وہ واقعی تشویش ناک بات ہے۔ مگر ہمیں حیرت ہے کہ بہت سے ساتھیوں کی رائے اس کے برعکس ہے۔ آنکھ مچولی کا ہر شمارہ ہماری طرف سے آپ کے لیے ایک تحفہ ہوتا ہے اور ہر بار ہم علیحدہ سے بھی کوئی نہ کوئی تحفہ دیتے ہی ہیں۔ دائرہ معلومات میں کوشش جاری رکھیئے، کبھی تو آپ کا نام بھی نکل ہی آئے گا۔ حامد علی شاہد۔ لاوہ:۔ حیرت انگیز طور پر آپ کا چوتھا خط شاملِ اشاعت ہے، غالباً یہ آپ کی ہمت اور مستقل مزاجی کا کمال ہے۔ غلطیوں کی نشاندہی کے لیے شکریہ! آپ نے "نئی تحریریں" میں کسی نقل شدہ کہانی کا حوالہ دیا ہے، مگر جلدی میں نام لکھنا بھول گئے۔ اسماء احمد۔ لیاقت آباد کراچی:۔ آپ کی تجویز سے پہلے ہی مشہور لوگوں کے بچپن کا سلسلہ شروع کیا جا چکا ہے۔ آپ کی شکایت بجا ہے کہ آپ کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی، مگر ہماری بھی مجبوری ہے کہ ہر ماہ سینکڑوں تحریریں موصول ہوتی ہیں۔ بہرحال دعا کیجیئے کہ آپ کا نمبر جلدی آ جائے۔

ایم اکرم سیال عاجز۔ ننکانہ صاحب:۔ پیارے بھائی آنکھ مچولی کے سارے قارئین ہمارے رشتے دار ہیں، اس لحاظ سے آپ بھی ہمارے اپنے ہوئے۔ نومبر کے ٹائیٹل نے آپ کو متاثر کیا۔ یہ پڑھ کر ہم بھی متاثر ہوئے "باباجی"، "حق اسکواڈ"، "آزادی یا موت"، "کوڑے دان"، "پناہ اور پاسبان" آپ کو پسند آئے شکریہ! آپ کی لاکھوں من دعائیں ان سطور کے ذریعے کارکنانِ آنکھ مچولی اور قارئین تک پہنچائی جا رہی ہیں۔ سارہ عمار۔ سیٹلائٹ ٹاؤن۔ کوئٹہ:۔ آپ نے نومبر کے شمارے کی ہر تحریر کی اتنی تعریف لکھی کہ ہم سے تو سنبھالی نہیں جا رہی ہے۔ "دریچہ" کی خصوصی پسندیدگی پر ہماری طرف سے خصوصی شکریہ قبول کیجیئے۔ آپ کی نعت متعلقہ شعبے میں پہنچ گئی ہے۔ مگر آپ نے نعت خط والے صفحے پر ہی لکھ دی۔ دوسرے ساتھی بھی نوٹ کر لیں کہ ہر تحریر کے لیے الگ الگ کاغذ استعمال کیا کریں شازیہ نوید۔ سرگودھا:۔ آپ نے بھی بہن سارہ عمار کی طرح ایک ہی صفحے پر خط اور انکل روبوٹ کے نام سوال لکھ دیا۔ خط کا جواب تو اس بار حاضر ہے۔ سوال کا جواب اگلی بار "نئی تحریریں" میں پڑھ لیجیے گا۔ خطوط ہر ماہ کی ۸ر تاریخ تک پہنچ جانے چاہئیں۔ ضیاء الرحمٰن۔ ڈنگہ، گجرات / خالد حمید اسلام آباد۔ آپ دونوں ساتھی سالانہ خریدار بننے کے خواہشمند ہیں، اس کے لیے آپ لوگ رسالے میں "خصوصی بچت اسکیم" کو غور سے پڑھیں، اس میں ساری تفصیل موجود ہے۔

محمد ندیم لطیف۔ سیالکوٹ:۔ سب سے پہلے معذرت، کہ آپ کے نام کے ساتھ سیالکوٹ کی جگہ پنڈی چھپ گیا۔ آپ کی یہ فرمائش کہ ٹی وی کے بعد "وی۔ سی۔ آر" پر بھی نظم ہونی چاہیئے، نوٹ کر لی گئی ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ ہم نے آپ کی تحریریں نہ شائع کرنے کی قسم بالکل نہیں کھائی۔ ہاں البتہ آپ ہمت نہ ہارنے کی قسم ضرور کھا لیجیئے۔ نوید احمد۔ سیٹلائٹ ٹاؤن۔ جھنگ صدر بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنے والد محترم اشتیاق احمد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ آپ کی کہانی "اپنا قاتل" موصول ہو گئی ہے۔ شائع ہو جائے گی۔ آپ کی مزید تحریروں کا انتظار۔۔۔ رہے گا۔ اوشاق علی جمالی۔ فرح ناز عزیز۔ جیلانی روڈ۔ سکھر:۔ دیکھ لیجیئے، آپ کی بہن کا اصرار کام کر گیا کہ آپ کا خط شائع ہو رہا ہے۔ قلمی دوستی میں آپ کا تعارف باری آنے پر شائع ہو جائے گا، مطمئن رہیں۔ اُمید ہے، آئندہ بھی آپ لوگ خط لکھتے رہیں گے

ہمارے ان ساتھیوں نے بھی ہمیں بہت اچھے اچھے خط لکھے، مگر جگہ کی کمی کے باعث ان کو شامل کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ان کے صرف نام شائع کیے جا رہے ہیں۔۔۔

• شازیہ فاروق۔ راولپنڈی • محمد اسحاق تبسم۔ ہری پور ہزارہ • محمد اعجاز خان بابر۔ ایل ایم سی کالونی۔ جامشورو • محمد اشرف جاوید۔ صمد پورہ۔ اوکاڑہ • عائشہ محمد عیسیٰ۔ مارکیٹ روڈ حیدر آباد • شبینہ بانو۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی • نائلہ بختیار۔ کوہاٹ • سید رضا امام نقوی۔ مقام نامعلوم • لیاقت علی خان۔ لاوہ • ابرار سعید عرف ٹیپو۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی • رحمت شیرازی۔ ٹنڈو آدم • جمشید علی مستانہ۔ تربت (مکران) • منظور حسین۔ شیر شاہ کالونی۔ کراچی • عامر (جماعت اوّل) • محمد ارسلان خالد۔ بھیرہ • عمر علی بیگ۔ اٹک شہر • فضل شاہ۔ گاؤں تہکال پایان کندے داؤد زئی • غلام حسین میمن۔ کھائی روڈ۔ حیدر آباد • میر عباس شاہ ہمدانی۔ عیدگاہ روڈ۔ ملتان • سلمان احمد خان۔ تہکال بالا۔ پشاور • افتخار علی چوہدری۔ مزنگ۔ لاہور • دولت حاجی موسیٰ مقام نامعلوم • محمد سیف اللہ۔ فروٹ مارکیٹ۔ بھابڑا • عبد الغفار۔ مٹھادہ منڈی۔ واربرٹن • اویس عزیز شیخ۔ ماڈل ٹاؤن۔ فیصل آباد • گل شیر علی۔ باڑہ گیٹ۔ پشاور • شوکت علی نوناری بھریا روڈ • شکیل احمد۔ جمرود۔ خیبر ایجنسی • محمد طاہر مقام نامعلوم۔

محمد اسلم شیخوپوری

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

جمادی الاوّل

ہمارے ہاں جو مہینوں کے نام رائج ہیں وہ دو قسم کے ہیں شمسی اور قمری۔ شمسی مہینوں کا تعلق سورج کی رفتار کے ساتھ ہے جبکہ قمری مہینوں کا دارومدار چاند پر ہے۔ اسلامی عبادات اور احکام کا دارومدار قمری مہینوں پر ہے اس لیے ان کو اسلامی مہینے بھی کہا جاتا ہے ورنہ ان مہینوں کے نام تو زمانۂ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت ہی میں رکھ دیے گئے تھے۔

اصل میں چاند کے طلوع وغروب اور اس کے گھٹنے اور بڑھنے کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، دیہاتی ہو یا شہری۔ جبکہ سورج کی مختلف منزلیں، اور ان کے نام، پھر اس کی پورے سال کی رفتار وغیرہ کا حساب سائنسی آلات اور وسیع علم اور تجربے کے بغیر نہیں لگایا جاسکتا۔

چونکہ دینِ اسلام ایک انتہائی آسان دین ہے اور ہر شخص کے لیے ہے اس لیے اسلام میں رمضان کے روزوں، دونوں عیدوں اور حج کا تعلق چاند کے دیکھنے کے ساتھ ہے۔

جمادیُ الاُوْلیٰ اسلامی سال کا پانچواں مہینہ ہے۔ عام طور پر لوگ جمادیُ الاوّل استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ گرامر کے مطابق اس کا صحیح تلفظ جمادیُ الاولیٰ ہے۔ لُغت میں جَمَدَ کے معنیٰ ہیں پانی کا جم جانا، کہا جاتا ہے کہ سخت سردی کی وجہ سے اس مہینے میں پانی جم جاتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عربوں کے حساب میں مہینے گردش نہیں کرتے تھے یعنی ٹھیک ہر موسم پر ہی ہر مہینہ آتا تھا، لیکن یہ بات کچھ جچتی نہیں۔ اس لیے کہ جب ان مہینوں کا حساب چاند پر ہے تو ظاہر ہے کہ موسمی حالت ہر ماہ پر ہر سال ایک جیسی نہیں رہے گی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جس سال اس مہینے کا نام رکھا گیا ہو اس سال یہ مہینہ سخت سردی میں آیا ہو اور سردی کی وجہ سے پانی جَم گیا ہو۔ جمادی الاولیٰ کی تین تاریخ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فوت ہوئے۔ وہ بہت بڑے فقیہہ اور مُفتی تھے۔ لوگ ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی خادم ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔

دریچہ

طاہر مسعود

۱۹۸۷ء کا تھکا ماندہ سورج ڈوب گیا۔

نئے سال کا نیا اور چمکیلا سورج دُنیا پر چمکنے کے لیے طلوع ہو چکا ہے۔ اس دنیا پر جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں۔ جہاں غم اور خوشیاں، دُکھ اور سُکھ، دُھوپ اور سائے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ یہ ہماری دنیا ہے۔ ہمارے بچّوں کی دُنیا۔ یہاں گول مٹول اور صحت مند بچّے رہتے ہیں۔ یہاں بھُوک اور افلاس سے بے حال لاغر بچّے بستے ہیں۔ یہ دو دُنیاؤں کے بچّے ہیں، ایک میں خوشیاں، رنگ اور روشنیاں ہیں، دوسری میں رنج و الم اور تاریکیاں، ایک دُنیا کے بچّے آسودہ حال گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں، تعلیم و تہذیب سے ان کی شخصیت میں چمک دمک آجاتی ہے۔ وہ پارکوں اور باغوں میں، ساحلِ سمندر اور کھیل کے میدانوں میں خوب بھاگتے دوڑتے ہیں، ہنستے ہیں، صاف سُتھرے کپڑے پہنتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے پالتو جانور اور کھلونے بھی خوش رہتے ہیں۔ بے شک یہ خوش نصیب بچّے ہیں۔ کیونکہ بڑے ہو کر انھیں بے کار اور آوارہ نہیں گھومنا پڑے گا۔

اور یہ دوسری دُنیا کے بچّے ہیں ان کی تصویریں آپ نے اخباروں میں دیکھی ہوں گی۔ مسلسل فاقے سے ان کے پیٹ آگے کو نکل آئے ہیں، شاید ان میں ہوا بھر گئی ہے اور ان کی پسلیاں آسانی سے گِنی جا سکتی ہیں۔ اِن کی خوراک کے لیے دُنیا بھر میں چندے جمع ہوتے ہیں، مگر ان کی بھُوک پھر بھی نہیں مٹتی۔ لاکھوں بچّوں کے ہجوم میں ایسے بھی ہیں جو بے گھر ہیں، بے وطن ہیں، ہر لمحہ، ہر آن خوف اور بے یقینی کا شکار ہیں۔ ان کی زرد آنکھوں سے افسردگی جھلکتی ہے۔ ان کے قدموں کے نیچے سے ان کی زمین کھینچ لی گئی ہے۔ یہ مہاجر ہیں۔ کھُلے آسمان تلے، بے خانماں کیمپوں کے اِرد گِرد مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور گھر کی پناہ حاصل بھی ہو تو گیراجوں اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور محنت کش بچّے کہلاتے ہیں۔

دوسری دنیا کے ان بچّوں کے لیے کئی عالمی ادارے وجود میں آچکے ہیں اور انھیں پولیو اور خُناق جیسی بیماریوں سے بچانے کے لیے ٹیکے اور انجکشن لگاتے ہیں۔ ان کے لیے عالمی سال مناتے ہیں۔ مگر یہ بچّے بدستور دُکھ بھوگتے ہیں، یا پھر بھُوک اور افلاس کے سفّاک ہاتھوں سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

نئے سال کا سورج سب ہی کو روشنی پہنچائے گا۔ چاند سب ہی کے لیے مہربان ہوگا پھُول سبھی کے لیے کِھلیں گے، ہوائیں سب کے لیے چلیں گی، اور ہماری دنیا کے بچّے جو سب یکساں پھُول کی طرح نازک اور ہرن کی طرح معصوم ہوتے ہیں کیا اس سال بھی ہمیشہ کی طرح روشنی اور تاریکی کی دو مختلف دُنیاؤں میں بٹے رہیں گے؟

مشہور افسانہ نگار رضیہ بٹ کی 'آنکھ مچولی' کیلئے تازہ ترین کہانی

عظمت

پرائیویٹ کمروں کے مریضوں کو دیکھنے کے بعد اب ڈاکٹر اسد وارڈ کا راؤنڈ لے رہے تھے. ان کے ساتھ جونیئر ڈاکٹر اور نرسیں بھی تھیں یہ ہسپتال کا خیراتی وارڈ تھا. یہاں ایسے مریض بھی تھے جن کے پاس دواؤں چھوڑ خوراک کے لئے بھی پیسے نہ تھے. ایسے بھی تھے جن کا کوئی والی وارث نہیں تھا ان کے دُکھ اور تکلیف کو دیکھتے ہوئے خدا ترسی کر کے کوئی ہسپتال میں داخل کروا گیا تھا. ڈاکٹر اسد کو ایسے مریضوں سے دلی ہمدردی تھی. اور وہ ان کا علاج تندہی سے کرنے کے علاوہ ان کی دلجوئی بھی کیا کرتے تھے. ہمت بھی بندھاتے تھے اور اپنے عملے کو ان کی دیکھ بھال کی بطورِ خاص ہدایت

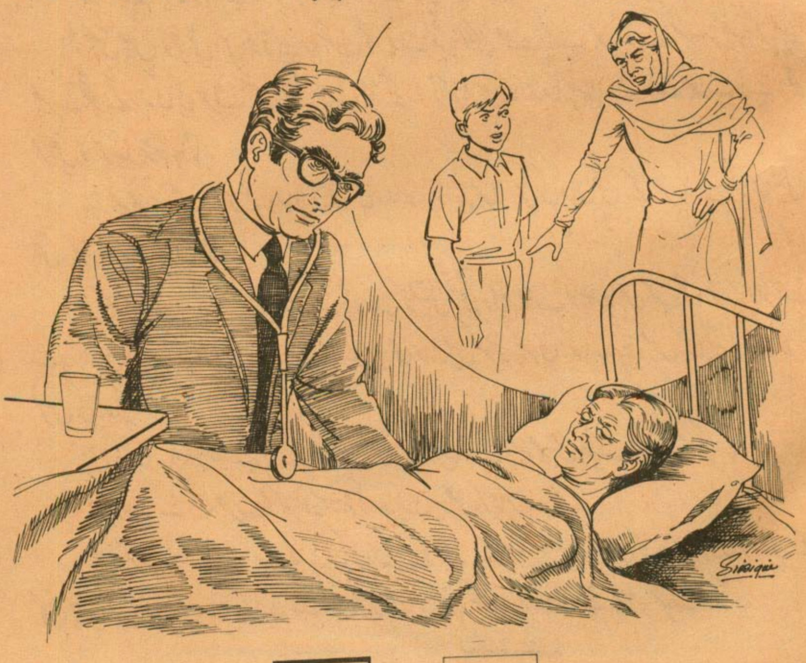

کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اسد بڑے نرم دل اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ بیس اکیس سال بیرونِ ملک رہنے کے بعد پچھلے سال پاکستان آئے تھے۔ اپنے ملک اور اپنے لوگوں سے انہیں دلی پیار تھا۔ خدمتِ خلق کا جذبہ دل میں موجزن تھا۔ اپنی جنم بھومی وطن کی مٹی میں محسوس کرتے تھے۔ اس لئے واپس وطن چلے آئے تھے۔ اور اب تن من سے لوگوں کی خدمت کر رہے تھے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ لیکن لوگ ان سے با آسانی مل سکتے تھے۔ اپنی تکلیفیں بے تکلفی سے بیان کرتے وہ ہر مریض پر ذاتی توجہ دیا کرتے تھے۔ مریض اور ان کے لواحقین ڈاکٹر اسد سے بہت مانوس تھے۔ انہیں یوں لگتا تھا کہ وہ کوئی غیر نہیں ان کے اپنے اور بالکل اپنے ہیں۔

ڈاکٹر اسد وارڈ کا راؤنڈ لے رہے تھے۔ ایک ایک بیڈ کے پاس جاتے مریض کی احوال پرسی کرتے۔ پُر مزاح انداز میں اس سے باتیں کرتے ہمت بندھاتے۔ چارٹ دیکھتے۔ بیماری کہاں پہنچی ہوتی اس کا مشاہدہ کرتے۔ ڈاکٹر دل سے مریض کے متعلق باتیں کرتے۔ ضرورت ہوتی تو دوا تبدیل کر دیتے۔ ورنہ پہلے ہی کی دوائیاں جاری رکھنے کا نرس سے کہہ دیتے۔

ڈاکٹر کا مخلصانہ اور ہمدردانہ رویہ پاکر مریضوں کو یوں لگتا جیسے ان کی آدھی تکلیف رفع ہو گئی ہے۔

"خدا آپ کو خوش رکھے ڈاکٹر صاحب"۔۔ جب مریض ان سے بجد متاثر ہوتا تو خلوص دل سے کہتا۔

"کبھی میں تو خوش اس وقت رہ سکوں گا جب تم بالکل صحت یاب ہو جاؤ گے۔ بستر چھوڑ کر چلنے پھرنے لگو گے زندگی کی طرف ہنسی خوشی لوٹ آؤ گے۔" ڈاکٹر مریض کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے جواب دیتے۔ تو مریض کا حوصلہ بڑھ جاتا۔

بیڈ نمبر چھ پر ایک دس گیارہ سالہ بچی لیٹی تھی۔ اسے ٹائیفائیڈ تھا۔ اس کی ماں بچی کے سرہانے دلگیر سی بیٹھی تھی۔ بخار اُتر کر پھر ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر بچی سے باتیں کرتے رہے اس کی ماں کو تسلی تشفی دی۔ "آپ کو بطورِ خاص کہا گیا تھا کہ بخار آنے کے بعد انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بچی سنا ہے پوری وارڈ میں گھومتی پھری۔ کھانے پینے میں بھی یقیناً احتیاط نہیں کی ہوگی"۔

بچی کی ماں سر جھکاتے ہوئے بولی "ڈاکٹر صاحب۔ میری بیٹی ٹھیک ہو جائے گی نا۔"

"ضرور ہو جائے گی۔ صرف ڈاکٹر اور سسٹر کی ہدایت پر عمل کرنا پڑے گا۔۔۔"

پھر ڈاکٹر نے ڈاکٹر بخاری سے کچھ باتیں کیں اس کیس کو اس کے سپرد کیا۔ نرس کو ہدایت دی اور بچی کے گال تھپتھپا کر بولے "دوائی کھانے سے انکار نہیں کرنا۔ اور بالکل آرام سے لیٹے رہنا۔ ٹھیک۔۔"

لڑکی بخار میں پھنک رہی تھی، پھر بھی ڈاکٹر کی پیار بھری باتوں پر مسکرا دی۔
بیڈ نمبر سات کے مریض کو بھی ڈاکٹر نے تسلی سے دیکھا۔
پھر بیڈ نمبر آٹھ کی طرف آئے۔ اس بیڈ پر ایک بوڑھی عورت آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ عورت کی خستہ حالی اس کے لباس سے ظاہر تھی۔
"سر یہ عورت رات کو داخل ہوئی تھی۔" نرس نے اس کا چارٹ ڈاکٹر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
"کون ڈاکٹر تھا ڈیوٹی پر۔" ڈاکٹر اسد نے چارٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ڈاکٹر ناجیہ ملک"۔
"ہوں"۔
ڈاکٹر نے کیس ہسٹری پڑھی۔ سو بیماریوں کی ایک بیماری بڑھاپا تھا۔ بخار کھانسی بگڑ گیا تھا۔ نظر بھی بہت زیادہ کمزور تھی، سر درد مستقل تھا۔ کمزوری بھی بہت تھی۔
ڈاکٹر نے ناجیہ ملک کی لکھی دوائیاں پڑھیں۔ دو ایک دوائیاں اور لکھیں اور چارٹ نرس کی طرف بڑھاتے ہوئے مریضہ کی طرف دیکھا۔ وہ جھکے اور نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ سٹیتھو اسکوپ گلے سے اتار کر اس کا سینہ چیک کرنے کے لئے کچھ اور جھکے۔
تو
تو
بوڑھی عورت کے چہرے پر ہی نگاہیں وہیں اٹک گئیں چہرے میں کچھ بھولی بھٹکی پرچھائیاں سی نظر آئیں۔ پہچان کے لئے انہوں نے پھر غور سے اس چہرے کو دیکھا۔
"یقیناً یہ وہی ہیں..." ڈاکٹر نے سر کو ہولے سے جھٹک کر پھر اس چہرے کو دیکھا۔ بیس پچیس برسوں کی دھول نے اس کے چہرے کو دھندلا دیا تھا۔ لیکن شناخت اور پہچان اس دھندلاہٹوں کے اندر بھی دیکھ سکتی تھی۔
ڈاکٹر نے نبض پر سے ہاتھ اٹھا کر جلدی سے نرس سے چارٹ مانگا۔ مریضہ کا نام اس پر درج تھا۔
"زاہدہ بیگم زوجہ شریف حسین۔"
ہاں یہ زاہدہ بیگم ہی تھیں۔ زاہدہ بیگم زوجہ شریف حسین۔
ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا۔ دونوں ڈاکٹر اور نرسیں حیران ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر بخاری نے جلدی سے پوچھا "کیا بات ہے سر"؟

نرس بھی قریب آتے ہوئے بولی۔ "سر یہ عورت ہوش میں ہے۔ ویسے ہی آنکھیں بند کئے پڑی رہتی ہے۔"

ڈاکٹر اسد نے پھر اک نگاہ اس مریضہ پر ڈالی۔

"یہ عورت ــ یہ عورت"۔ ڈاکٹر اسد نے گہری سانس لی۔

"آپ۔ آپ جانتے ہیں اسے سر"۔ ڈاکٹر جوّاد نے پوچھا۔ ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ پھر نرس سے بولے..

"انہیں کون ایڈمٹ کروا کے گیا ہے"؟

"سر کوئی آدمی تھا"۔

"وہ انہیں دیکھنے آئے تو مجھے ضرور بتانا"۔

"یس ڈاکٹر"۔ نرس نے جلدی سے کہا۔

ڈاکٹر اسد ایک بار پھر اس پر جھک گئے۔ اس کا معائنہ کیا۔ اور نرس کو اُن کی بطورِ خاص نگہداشت کرنے کا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ کئی بار انہوں نے پلٹ پلٹ کر اس مریضہ کو دیکھا۔ جو بے بسی اور کسمپرسی کی جیتی جاگتی تصویر بنی بیڈ پر پڑی تھی۔

دونوں ڈاکٹروں اور نرسوں نے محسوس کیا کہ اس مریضہ کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر اسد خاصے پریشان ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر اسد راؤنڈ ختم کر کے اپنے کمرے میں آئے تو واقعی نڈھال سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور سر کرسی کی پشت پر ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

"زاہدہ بیگم اور اس خیراتی وارڈ میں"۔ وہ اِدھر اُدھر اپنے سر کو جھٹک کر بے یقینی سے سوچ رہے تھے۔ لیکن حقیقت تھی وہ زاہدہ بیگم ہی تھیں۔ جو خیراتی وارڈ کے بیڈ پر بے بسی اور بیکسی کا مُرقّع بنی پڑی تھیں۔ یہ زمانے کے انقلابات تھے یا قدرت کا انتقام۔ ڈاکٹر اسد سوچ رہے تھے۔ اور ان کی سوچ ہولے ہولے ماضی میں اُتر رہی تھی۔

کوئی پچیس برس پہلے ڈاکٹر اسد کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی۔ وہ اپنی بیمار بیوہ ماں کے ساتھ ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن گاؤں میں صرف پرائمری تک اسکول تھا۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد ضد کی کہ آگے پڑھوں گا۔ ماں بیمار تھی۔ بہت سمجھایا کہ یہاں کوئی اسکول نہیں ہے

جہاں آگے پڑھ سکو۔ لیکن اسد ایک ہونہار طالب علم تھے۔ بولے "ماں مجھے شہر بھیج دو نا۔ میں وہاں پڑھوں گا۔ پڑھ کر ڈاکٹر بنوں گا۔ پھر تمہارا علاج کروں گا۔"

ماں ان کی بات پر کبھی ہنس دیتی۔ کبھی ڈانٹ دیتی۔

لیکن لگن سچی تھی۔ برابر کے گاؤں میں مڈل اسکول تھا۔ اسد نے وہاں داخلہ لے لیا۔ لیکن سات میل روز آنا جانا بہت مشکل تھا۔ یہ مشکل یوں دور ہوئی کہ انہی دنوں ان کی ماں کے دور پرے کے عزیز شریف حسین کسی کام کے سلسلے میں گاؤں آگئے۔ اسد کے متعلق ماں نے بتایا تو اس بچے کے شوق اور ولولے سے بڑے متاثر ہوئے بولے "میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ وہاں داخل کروادوں گا۔ اگر اسی طرح محنت کرتا رہا تو ضرور ایک نہ ایک دن ڈاکٹر بن جائے گا۔"

ماں بیٹے کو اپنے سے الگ تو نہ کرنا چاہتی تھی لیکن بیٹے کی راہ کی رکاوٹ بھی نہیں بننا چاہتی تھی بچے کو شہر بھیجنے پر آمادہ ہو گئیں۔

"خدا کے بعد تمہارے حوالے ہے شریف بھائی۔ اس کا خیال رکھنا" ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا کر کہا۔

"تم فکر نہ کرو بہن۔ جہاں میرے دو بیٹے ہیں وہاں یہ بھی سہی۔ ان کے ساتھ ہی پڑھا کرے گا۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس۔ اس کے جانے سے کیا فرق پڑے گا۔"

ماں نے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اسد کو پیار کیا۔ سمجھایا کہ اسے وہاں کیسے رہنا ہے۔

یوں اسد شریف حسین کے ساتھ شہر آگیا۔ شریف حسین کا گھر خاصہ بڑا تھا۔ اس گھر میں ان کی بیوی زاہدہ بیگم اور دو بچے اظہر و طاہر بھی تھے۔ اظہر اسد کا ہم عمر ہی تھا اور طاہر دو سال چھوٹا تھا۔ بچے تو اسد کے آنے سے بہت خوش ہوئے کہ کھیلنے کو ایک ساتھی مل گیا۔ لیکن اسد نے اس کم عمری میں بھی زاہدہ بیگم کے چہرے پر ناپسندیدگی کی پرچھائیاں محسوس کرلیں۔ بڑے غرور اور نفرت سے اس نے اس غریب بچے کو دیکھ کر شریف حسین سے کہا تھا "اسے کہاں سے اٹھا لائے۔ تمہارے رشتہ داروں کے بوجھ اٹھانے کو ہم ہی رہ گئے ہیں۔"

شریف حسین نے اسے سمجھایا تھا۔ جانے کیا کچھ کہا تھا۔ لیکن اسد کے دل میں اس عورت سے ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ زاہدہ بیگم ان دنوں ضرورت سے زیادہ ہی صحت مند تھیں۔ گھر پر ان کی حکمرانی تھی۔ اسد ایک مفت کا نوکر ان کے ہاتھ آگیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی اس کے آنے سے خوش نہ تھیں۔ شریف حسین

کے سامنے تو کچھ نہ کہتیں۔ بعد میں خوب لتے لیتیں۔ بات بات پر ڈانٹتیں۔ مار پھٹکار سے نہ چُوکتیں۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو منہ بناتیں "مُوا، کتنا کھاتا ہے۔ پیٹ ہے یا کنواں۔ میرے دونوں بچّوں کا حصہ یہ کھا جاتا ہے" وہ اس کی نقلیں اتارتے ہوئے کہتیں۔

اظہر اور طاہر جنہوں نے پہلے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ ماں کی دیکھا دیکھی اسد پر رعب جمانے لگے تھے۔ نوکروں کا سا سلوک کرتے۔ ٹھُڈّے اور مکّے مارنا تو عادت بنالی تھی۔ گالی گلوچ پر بھی اُتر آتے۔

اسد کو شریف حسین نے اپنے بچّوں ہی کے ساتھ اسکول میں داخل کروانا چاہا تھا۔ لیکن زاہدہ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ "اتنی فیسیں دیتے ہیں اپنے بچّوں کی۔ اس کے لئے خواہ مخواہ کا بار اپنے اوپر ڈال لیں۔ بڑا پڑھ لکھ کر کوئی شئے بن جائے گا۔ غریبوں کے بچّے اتنے لائق نہیں ہوتے کہ ان اسکولوں میں پڑھیں۔ داخل کرا دو گورنمنٹ اسکول میں" اسد کو گورنمنٹ اسکول میں ہی داخل کروا دیا گیا۔ یہ اسکول گھر سے میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ اسد پیدل اسکول آتا جاتا۔ حالانکہ اظہر اور طاہر کا اسکول اس سے قریب تھا۔ پھر بھی تانگے پر آتے جاتے تھے۔

اسد بچّہ تھا۔ کبھی کبھی بہت شدت سے اس فرق کو محسوس کرتا تھا۔ لیکن اسے علم حاصل کرنے کی لگن تھی۔ اس کے ذہن میں ڈاکٹر بننے کا مُصمّم ارادہ تھا۔ اس لئے وہ ہر دُکھ تکلیف اور جبر بڑے صبر سے برداشت کئے گیا۔ صبح اُٹھتے ہی زاہدہ اسے باورچی خانے کے کام میں لگا دیتیں۔ اسکول جانے سے پہلے وہ برتن دھوتا۔ بستر ٹھیک کرتا۔ اور طاہر اظہر کے جوتے پالش کرتا۔ واپس آکر بھی کھیلنے کی بجائے زاہدہ بیگم اس سے گھر کے کام لیتیں۔ اسکول کا کام کرنے کی بھی فرصت نہ دیتیں۔ یہ کام وہ جب فارغ ہو کر سونے کے لئے جاتا تب کیا کرتا۔ رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ ان حالات میں بھی اس نے امتحانوں میں فرسٹ پوزیشن لی۔ اظہر اور طاہر معمولی نمبر لے کے پاس ہوئے۔

شریف حسین نے اس کی ہمّت بندھائی خوب شاباش دی۔ جس سے زاہدہ بیگم جل بھُن گئیں۔ جب شریف حسین باہر گئے تو اس نے اسد کا کان مروڑتے ہوئے کہا "بڑا تیر مار لیا۔ میرے بچّوں کو باپ کی نظروں سے گرانا چاہتا ہے۔ اگلے سال بھی فرسٹ آیا تو تیری جان نکال دوں گی۔"

اسد پریشان ہو گیا۔ بیچارے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کرے۔ اب زاہدہ بیگم اور بھی سختی کرنے لگی تھیں۔ وہ رات کو پڑھنے بیٹھتا تو بتی بجھانے کا حکم دے دیتیں۔ وہ روتا رہتا۔ سوچتا رہتا۔ بیچارے نے بڑی سختیاں جھیلیں۔ گلی میں جلنے والی سرکاری بتی کی روشنی چھت پر پڑتی تھی۔ وہ اس روشنی میں کتابیں لے کر بیٹھ جاتا۔ صبح سویرے اُٹھ کر باہر نکل جاتا۔ اور صبح کے ملگجے اُجالے میں سبق یاد کر لیا کرتا۔ کبھی موم بتیاں لے آتا اور وہ جلا جلا کر اسکول کا کام

کرتا۔ زاہدہ بیگم جتنی سختی کرتیں۔ اس کی لگن اتنی ہی بڑھتی۔ وہ دل ہی دل میں کہتا "میں نے بھی عزم کرلیا ہے۔ ایک نہ ایک دن ڈاکٹر بن کے ہی رہوں گا۔" اس کے دل میں زاہدہ بیگم کے لئے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ ایسی سفاک اور پتھر دل عورت سے ایک بچہ نفرت ہی کرسکتا تھا۔ اگلے سال بھی نتیجہ حسب سابق رہا۔ وہ فرسٹ آیا اور اظہر فیل ہوگیا طاہر بھی معمولی نمبرے کر پاس ہوا۔ زاہدہ بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ بچّے کے فیل ہونے کا غصہ اسد پر نکالا۔ اسد کے ہاتھ سے ایک گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔ اسی بہانے کی آڑ میں اس نے اسد کو اتنا مارا پیٹا کہ اس کے ناک منہ سے خون بہنے لگا۔ اس دن وہ بہت رویا۔ بہت بددل ہوا۔

اس کی کامیابی کے ساتھ ساتھ زاہدہ بیگم کے مظالم بڑھتے گئے۔ اسد برداشت کرتے کرتے تھک گیا اسی دوران اس کی ماں بھی مرگئی۔ اور وہ دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ وہ بہت دکھی تھا۔ صرف شریف حسین ہی تھے جو اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھتے تھے۔ لیکن زاہدہ بیگم ان کے ساتھ لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ اسد اب سیانا ہوگیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کی وجہ سے اس گھر میں جھگڑا ہوتا ہے۔

ایک رات اس نے چپکے سے اپنے کپڑے اور کتابیں سمیٹیں اور گھر سے نکل گیا۔ اس نے اس گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔ اور جدّوجہد شروع کردی۔ اس نے مزدوری کی۔ دکانوں کے تھڑوں پر راتیں گزاریں کئی کئی دن بھوکا رہا لیکن پڑھائی نہیں چھوڑی۔ دن رات محنت کی اور دسویں میں پہنچ گیا۔ اتفاقاً ہی اس کے ایک ماسٹر صاحب کو اس کے حالات کا علم ہوا۔ اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کی۔ اتنا ہونہار طالبعلم تھا وہ۔ دونوں نے کچھ اپنے پاس سے اور کچھ اسکول فنڈ سے اس کی مدد کی۔ اسکول ہی میں رہنے کی جگہ دی۔ وہ دلجمعی سے پڑھنے لگا۔ دسویں میں اس نے بورڈ میں پوزیشن لی۔ وظیفہ ملا۔ ماسٹر صاحب نے سرپرستی کی۔ اور وہ ایف ایس سی میں بھی ٹاپ پر آیا۔ اب میڈیکل میں داخلے اور خرچ کا سوال تھا۔ جو ایک مخیّر انسان نے پورا کردیا۔ یہ نیک انسان ہیڈ ماسٹر کے ملنے والوں میں سے تھا۔ دوبئی میں رہتا تھا اور اکثر و بیشتر غریب طالب علموں کی مدد کیا کرتا تھا۔ اسد ڈاکٹر بن گیا تو وہ اسے اپنے ساتھ دوبئی لے گیا۔ نوکری دلائی۔ ہمت بندھائی۔ یوں اسد شاہراہِ زندگی پر کامیابی سے قدم رکھتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ پیسے خاصے جمع ہوگئے --- تو وہ ہائر اسٹیڈیز کے لئے انگلینڈ چلا گیا۔ پھر امریکہ گیا۔ یوں وہ کامیاب و کامران زندگی گزارنے لگا۔ اپنے محسن کی بیٹی سے شادی بھی ہوگئی۔ بھرپور اور کامیاب زندگی کی راہیں استوار ہوگئیں۔

اب برسوں بعد ڈاکٹر اسد پاکستان آئے تھے اور اس ہسپتال میں اپنی محنت وشفقت اور محبت سے لوگوں کے دل جیت رہے تھے۔

"سر" نرس نے کمرے میں آتے ہوئے آواز دی۔ ڈاکٹر اسد خیالوں کی بھول بھلیوں سے چونک کر نرس کی طرف دیکھنے لگے۔

"سر۔ نرس۔۔۔ مؤدبانہ بولی!" بیڈ نمبر آٹھ کی مریضہ کے رشتہ دار آئے ہیں۔ آپ نے کہا تھا جب وہ آئیں تو آپ کے پاس بھیج دیں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ بھیج دو انہیں۔" ڈاکٹر اسد نے سر کو جھٹک کر کہا۔ ان کے ذہن میں اظہر اور طاہر کی شبیہہ گھوم گئی۔ "ضرور ان میں سے کوئی آیا ہوگا۔"

دروازہ کھلا اور ایک چالیس پینتالیس برس کا آدمی مؤدبانہ انداز سلام کرتے ہوئے اندر آگیا۔ یہ اظہر نہیں تھا اور نہ ہی طاہر تھا۔ کوئی اور ہی تھا۔

ڈاکٹر نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر پوچھا زاہدہ بیگم کو آپ نے ایڈمٹ کروایا ہے۔"

"جی۔"

"آپ ان کے کیا لگتے ہیں۔"

"لگتا تو کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب۔ بس خدا ترسی کہہ لیں۔ بیچاری تنہا ہیں بالکل۔ بیمار پڑگئیں تو کوئی احوال پرسی کرنے والا نہیں تھا۔ ہم نے انہیں اپنا ایک کمرہ دے رکھا ہے۔ ہمارے پاس ہی رہتی ہیں۔"

"لیکن۔ لیکن ان کا گھر۔ ان کا شوہر اور دو بچے۔"

"آپ انہیں جانتے ہیں۔۔؟ ڈاکٹر صاحب۔ شوہر کو فوت ہوئے عرصہ گزر گیا۔ گھر بچوں نے بیچ دیا بڑا لڑکا بیوی بچوں سمیت کراچی چلا گیا۔ چھوٹا کہیں باہر رہتا ہے۔ دونوں بیٹے ماں کو بالکل نہیں پوچھتے۔ برسوں بعد کبھی آکر مل جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھار کچھ روپے بھیج دیتے ہیں۔ بس بہت دکھی ہیں بیچاری۔"

وہ آدمی زاہدہ بیگم پر بیتے رنج و غم کے دنوں کی داستان ڈاکٹر اسد کو سنا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی آنکھوں کے سامنے وہ مہ و سال پلک جھپک گزر رہے تھے۔ جو انہوں نے زاہدہ بیگم کے ہاں گزارے تھے۔ اُن دنوں وہ کتنی صحت مند گوری چٹی کھڑکے اور دھڑکے والی عورت تھی اور اب بے بس و بے کس جس کا ساتھ اس کے سگے بچوں نے چھوڑ دیا تھا گھر بار رہا تھا نہ روپیہ پیسہ۔ انہیں چیزوں پر وہ ان دنوں کتنا اترایا کرتی۔۔۔ تھیں اور کتنی بے رحمی سے اسد سے پیش آتی تھیں۔

اسد کا جی ایک بار تو چاہا کہ اس سفاک اور پتھر دل عورت کی حالت پر جی کھول کر قہقہے لگائیں۔ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہیں کہ دیکھو جسے تم ٹھوکروں کے قابل سمجھتی تھیں آج کتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کے پاس دنیا کی

ہر سہولت ہے۔ روپیہ پیسہ ہے۔ شہرت، عزت، دولت سبھی کچھ ہے اور۔ تم۔ تم کس حال کو پہنچ چکی ہو۔ لیکن ۔۔۔۔۔

ڈاکٹر اسد ایسا نہیں کرسکے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ دکھ دینا نہیں دکھ بانٹنا جانتے تھے۔ بے بسی اور بے کسی کی زندگی کا انہیں پورا احساس تھا۔ زاہدہ بیگم سے بدلہ تو زندگی نے خود ہی لے لیا تھا۔ مار ڈالا تھا انہیں۔ اب ڈاکٹر اسد اور کیا مارتے۔ قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ یہ بندے کا حساب خود چکا دیتی ہے۔

ڈاکٹر اسد نے اس بے بس اور لاچار عورت کو دل سے معاف کردیا۔ اس آدمی سے بولے "آپ کی بہت مہربانی جو آپ نے ان کا اتنا خیال رکھا۔ آج سے ان کی نگہداشت میرے ذمہ ہے۔ دور پار کی ہی لیکن میری عزیزہ ہیں۔ ٹھیک ہونے پر بھی یہ میرے ہاں رہیں گی۔"

ڈاکٹر اسد نے زاہدہ بیگم کو وارڈ سے پرائیوٹ کمرے میں منتقل کروادیا۔ اس کے سارے اخراجات خود برداشت کئے۔ علاج تندہی سے کیا۔ وہ دو، تین ہفتوں ہی میں اچھی ہوگئیں۔

ڈاکٹر اسد نے اپنا آپ ان پر ظاہر نہیں کیا۔ اپنے آپ کو اظہر کا جگری دوست بتایا اور اس ناطے سے انہیں اپنے گھر رہنے پر آمادہ کیا۔

اب زاہدہ بیگم ڈاکٹر اسد کے گھر پر بڑے آرام اور سکون سے رہ رہی ہیں۔ ڈاکٹر اسد نے انہیں ابھی تک نہیں بتایا کہ وہ کون ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ زاہدہ بیگم ماضی کے حوالے سے شرمندہ ہوں۔ یہ ڈاکٹر اسد کے کردار کی عظمت ہے۔ اور ایک عظیم انسان ہی ایسا کرسکتا ہے۔

سب سے بڑا جانور

تمام جانوروں میں سب سے بڑا جانور بلیو وہیل ہے۔ جس کی لمبائی ۳۰ میٹر (۱۰۰ فٹ) تک ہوتی ہے۔

ڈائنوسار

۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ سال سے ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ سال قبل تک پایا جانے والا یہ جانور اگر آج موجود ہوتا تو ہاتھی اس کے سامنے بونا معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ اس ہیبت ناک جانور ڈائنو سار کا قد چودہ میٹر (۴۵ فٹ) تھا اور اس کے وزن کا اندازہ سو ٹن لگایا گیا ہے۔ یہ ڈائنو سار ان خطوں میں پایا جاتا تھا جنہیں آج افریقہ اور شمالی امریکہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

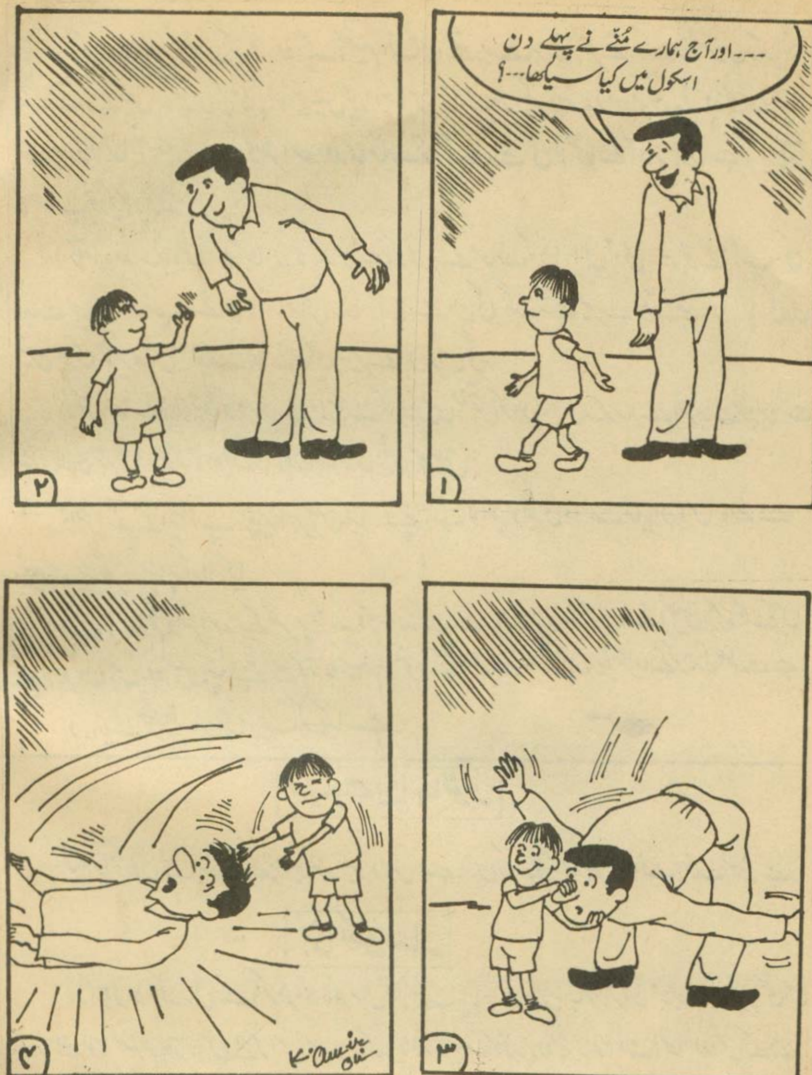
---اور آج ہمارے مُنّے نے پہلے دن
اسکول میں کیا سیکھا---؟
۱
۲
۳
۴

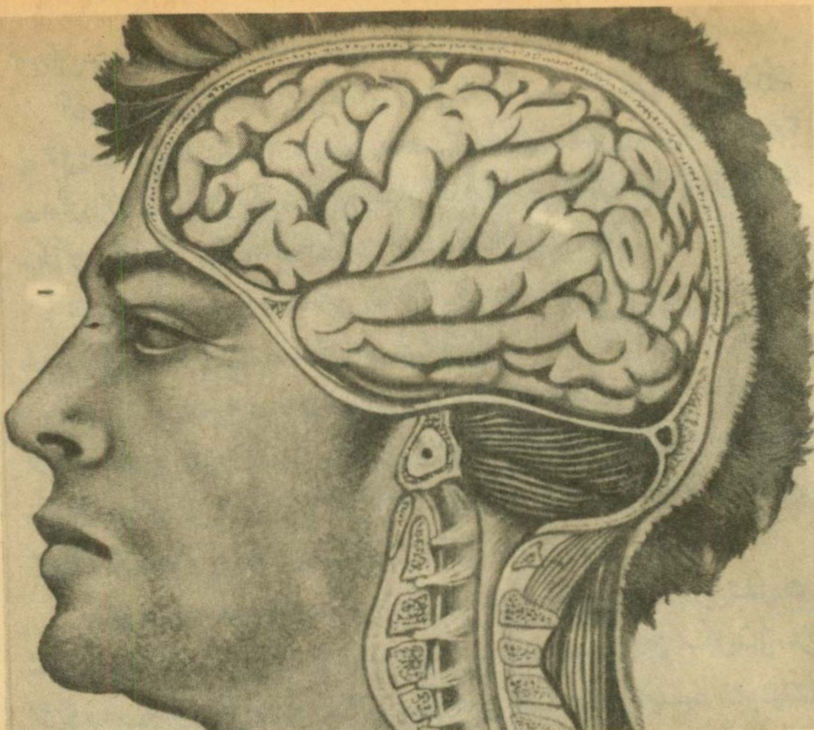

شاہ نواز فاروقی

انسانی دماغ زِندہ کمپیوٹر

انسانی جسم کے تمام اعضاء میں دماغ سب سے زیادہ پیچیدہ عضو ہے۔ اس کی پیچیدگی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آج جب کہ انسان کائنات کے سب سے ننھے ذرّے یعنی ایٹم کو توڑ کر اُس کے رازوں سے واقف ہو چکا ہے۔ چاند کو تسخیر کر کے دوسرے سیاروں کو فتح کرنے کے لیے عملی اقدامات کر رہا ہے۔ انسانی دماغ دنیا بھر کے سائنس دانوں کے لیے ابھی تک ایک معمّہ بنا ہوا ہے۔

انسانی دماغ پر ہونے والی اب تک کی تحقیقات سے ہمیں دماغ کے صرف ۱۰ فیصد حصّے کے بارے میں معلوم ہو سکا ہے کہ وہ کیا کام انجام دیتا ہے۔ انسانی دماغ کا باقی ۹۰ فیصد حصّہ کیا افعال انجام دیتا ہے۔ اس کے بارے میں ہمیں کچھ

معلوم نہیں ہے۔ آج بھی دنیا بھر میں سینکڑوں ماہرین انسانی دماغ کے معمّے کو حل کرنے کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں۔

اگر آپ انسانی دماغ کے نقشے کو دیکھیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ گلوب کے نقشے سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ انسانی دماغ کو نارمل حالت میں کام کرنے کے لیے ایک منٹ میں ۰٫۷۵ لیٹر خون درکار ہوتا ہے اور اگر دماغ کو ملنے والی آکسیجن اور گلوکوز کی فراہمی ایک منٹ کے لیے بھی معطل ہو جائے تو انسان بے ہوش ہو جائے گا۔ اور اگر آکسیجن اور گلوکوز کی فراہمی تقریباً آٹھ منٹ تک معطل رہے تو انسان ہلاک ہو جائے گا۔

انسانی دماغ کی ساخت برسات کے موسم میں خود بخود اُگ آنے والی سانپ کی چھتری سے مشابہت رکھتی ہے انسانی دماغ کی ساخت کو سمجھنے کے لیے اُسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسانی دماغ کا وہ حصہ جو سب سے پہلے دریافت ہوا تھا انسان کے بہت اہم افعال جیسے حرکتِ قلب، تنفس اور کھانسنے وغیرہ کو کنٹرول کرتا ہے۔ جبکہ انسانی دماغ کے دوسرے حصے میں جذبات، ذائقہ اور سونگھنے کی صلاحیتیں موجود ہیں اسی طرح دماغ کا تیسرا حصہ جو کچھ ملین برس قبل ہی مسلسل ارتقاء کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے انسان کو مختلف اشاروں کو سمجھنے، گفتگو کرنے اور تجریدی انداز میں سوچنے کے قابل بناتا ہے۔

جب بچّہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اُس وقت اُس کے دماغ کے اعصابی خلیوں کے وجود میں آنے کی رفتار ۲۴۰۰۰۰ فی منٹ ہوتی ہے اور یہ عمل مسلسل نو ماہ تک جاری رہتا ہے ایک اندازے کے مطابق ایک مکمل انسانی دماغ تقریباً ۱۰ ارب خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ انسانی دماغ کے ہر اعصابی خلیے کے ساتھ اسی نوعیت کے اور بھی خلیے ہوتے ہیں اور ان خلیوں کو آپس میں جوڑنے والی بال سے بھی زیادہ باریک رگیں ہوتی ہیں۔ خلیوں اور ان باریک رگوں سے مل کر مکڑی کے جالے کی طرح کی ایک شکل بن جاتی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کی ذہنی صلاحیت بڑی حد تک انسانی دماغ کے اعصابی خلیوں کے وجود میں آنے کی رفتار اور ان خلیوں کو آپس میں ملانے والی رگوں یا نسوں کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ دماغ میں خلیوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والی رگوں کے وجود میں آنے کی رفتار ایک ہزار فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ تاہم ماہرین ابھی تک یہ بتانے کے قابل نہیں ہو سکے ہیں کہ ایک ارب خلیوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والی رگوں کی کل تعداد کتنی ہوتی ہے؟۔۔۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ جس انسان کے دماغ میں جتنی زیادہ رابطہ پیدا کرنے والی رگیں ہوں گی وہ اتنا ہی زیادہ ذہین ہوگا۔

انسانوں کے چہروں کی طرح انسانی دماغ کے اعصابی خلیے بھی ایک دوسرے کی طرح نہیں ہوتے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانی دماغ کا ہر خلیہ ایک کیمیاوی کارخانے کی طرح ہے۔ کیونکہ یہ بے حد ننھا سا خلیہ ہزاروں اقسام کے کیمیاوی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔

آپ یہ پڑھ کر یقیناً حیران ہوں گے کہ یہ اعصابی خلیے چیونٹیوں کی طرح آپس میں گفتگو بھی فرماتے ہیں اور اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کیمیاوی اشارے یعنی کوڈز استعمال کرتے ہیں۔ وہ کیمیاوی عناصر جن کی مدد سے یہ اعصابی خلیے آپس میں گفتگو کرتے ہیں اصطلاح میں MEDIATORS یعنی رابطہ پیدا کرنے والے کہلاتے ہیں۔ اب تک ان کیمیائی عناصر میں سے چالیس کی شناخت ہو چکی ہے، لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ یہ تعداد بڑھ سکتی ہے۔

اعصابی خلیے آپس میں گفتگو کے لیے کیمیاوی زبان کے علاوہ اُس برقی رَو کو بھی اپنا پیغام ایک دوسرے تک پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں جو انسانی دماغ میں ہر وقت جاری رہتی ہے سائنس والوں کا خیال ہے کہ اگر اعصابی خلیوں کی کیمیاوی اور برقی سرگرمیوں کو کنٹرول کر لیا جائے تو انسان کی بہت سی دماغی بیماریوں کا علاج ممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ اس صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سوئٹزر لینڈ کے ایک سائنس دان ہیس نے ۱۹۲۴ء میں انسانی دماغ میں خاص طور پر تیار کردہ آلہ ELECTRODE لگانے کا تجربہ کیا تھا جس کی مدد سے انسانی دماغ کے ایک اعصابی خلیے کی آواز سننا بھی ممکن ہو گیا تھا۔ تاہم ان اعصابی خلیوں کے مختلف اشاروں کے کیا معنی ہیں؟ اور بحیثیتِ مجموعی انسانی دماغ کس اصول کی بنیاد پر کام کرتا ہے؟ ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی واضح جواب سائنس والوں کے پاس نہیں ہے۔

اُنیسویں صدی میں ایک جرمن سائنس دان ویگزنے انسانی دماغ کے سلسلے میں ایک بڑا دلچسپ تجربہ کیا تھا۔ ویگز کا خیال تھا کہ دنیا کے ذہین ترین افراد چونکہ فکر و دانش کے اعتبار سے دیگر لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کے اعصابی خلیے کا بھورا حصّہ جو کہ خلیے کا بنیادی حصہ ہوتا ہے۔ یقیناً ساخت کے اعتبار سے عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہوگا۔ تاہم اُسے اپنے تجربے سے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ وہ عام انسانوں اور غیر معمولی ذہانت رکھنے والوں کے اعصابی خلیوں کی ساخت میں کوئی فرق دریافت کرنے میں ناکام رہا۔

ایک زمانے میں سائنسدانوں کا یہ خیال بھی رہا کہ جس شخص کے دماغ کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کم وزن کا دماغ رکھنے والے شخص سے زیادہ ذہین ہوتا ہے، لیکن تجربوں نے اس مفروضے کو بھی غلط ثابت کر دکھایا۔ مثال کے طور پر روس کے عظیم ناول نویس اور افسانہ نگار ترگنیف کے دماغ کا کل وزن دو کلوگرام تھا جبکہ فرانس کے عظیم ناول نگار اناطول فرانس کے دماغ کا وزن صرف ایک کلوگرام تھا، لیکن یہ دونوں حضرات غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے حامل تھے گویا اس بات کا تعین ابھی تک نہیں ہو سکا ہے کہ انسانی ذہانت کو ناپنے کا سائنسی اصول کیا ہے؟

انسانی دماغ کو اُس کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی بناء پر جدید سائنس میں "زندہ کمپیوٹر" کا نام دیا گیا ہے۔ تاہم یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ انسانی دماغ کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے، لیکن جیسا کہ برطانیہ کے نوبل انعام یافتہ سائنسدان فرانسس کرِک نے کہا ہے کہ انسانی دماغ کے بارے میں ہماری معلومات کی نوعیت ابھی تک ایک فریب کے سوا کچھ نہیں

ہے کیونکہ ہم اپنے دماغ میں آنے والے خیالات کا ایک نہایت معمولی حصّہ یاد رکھ پاتے ہیں اور اب جبکہ سائنسدان للکھوں کہکشاؤں کے درست نقشے تیار کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ انسانی دماغ ابھی تک سائنس دانوں کے لیے ناقابلِ حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی دماغ کی کارکردگی کے بارے میں ہماری بیشتر معلومات قیاسات کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔

البتہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انسانی دماغ کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے تو یہ بات بعض ایسے لوگوں نے ثابت کر دی ہے جو دنیا بھر میں باقاعدہ طور پر اپنی ذہانت اور ذہنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں نے کمپیوٹر کی کارکردگی کو چیلنج کیا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے کمپیوٹر کو شکست بھی دی ہے۔ مثال کے طور پر آج سے تقریباً بیس سال پہلے ڈیگوبرٹ نام کے ایک فرانسیسی نے دعویٰ کیا تھا کہ کمپیوٹر جتنے وقت میں صرف سات سوال حل کرے گا وہ اتنی مدت میں۔۔۔ دس سوالات حل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کے اور کمپیوٹر کے درمیان دس سوالات حل کرنے کا مقابلہ ہوا۔ اور حیرت انگیز طور پر ڈیگوبرٹ نے کمپیوٹر سے ایک منٹ ۳۵ سیکنڈ پہلے دس کے دس سوالات حل کر دیے۔

انسانی ذہن کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ انسانی یادداشت بھی حیرت انگیز واقع ہوئی ہے۔ سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آدمی ایک ہفتے میں ایک غیر ملکی زبان سیکھ سکتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ اُس زبان کے ایک ہزار الفاظ بھی ایک بار پڑھ کر یاد رکھ سکتا ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ انسانی دماغ بے پناہ حیرت انگیز صلاحیتوں کا حامل ہے اور ابھی ہم نے صرف یہ جاننا شروع کیا ہے کہ ایک فرد کس قدر قابلیتوں کا حامل ہو سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی دماغ ایک ایسا جادو بھرا صندوق ہے جس کے تالے کی چابی کھو گئی ہے اور جس دن کسی شخص کو یہ کھوئی ہوئی چابی مل گئی وہ دن انسانی زندگی میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرے گا جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

برّاعظم ایشیا

دنیا کے سب سے بڑے برِّاعظم ایشیا کا رقبہ چار کروڑ چوالیس لاکھ چھبیس ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس برّاعظم میں واقع ممالک کے باشندوں کی بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے جن کا ایک طویل سلسلہ انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلا ہوا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے کرۂ ارض کا مرکز بھی اسی برّاعظم میں واقع ہے۔ جسے خانۂ کعبہ کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا مذہبی و روحانی مرکز بھی ہے۔

سیّد خورشید عالم

وہ ایک تاریخی دِن

"کیتھرین ۔۔۔ ان لوگوں کا کوئی خط آیا؟"

درمیانی عمر کی ایک خوبصورت عورت نے اپنے باپ بشپ ملٹن رائٹ کو دیکھا اور پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی "یقیناً وہ اپنے جہاز کی مرمّت میں لگے ہوں گے"۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اپنے باپ سے کہنے لگی "ابّا جان میری کتنی خواہش تھی کہ وہ کرسمس گھر پر منائیں۔ اور وِل اور وِلبر کے بغیر کرسمس کا بالکل مزہ نہیں آئے گا۔"

شمالی کیرولینا میں کِٹی ہاک نامی ساحل کے کنارے سات افراد ایک جگہ جمع تھے۔ وہ سب ایک عجیب وغریب مشین کی مرمّت کر رہے تھے۔ اس مشین کو انھوں نے ہوائی جہاز کا نام دیا تھا۔ اُن میں سے پانچ افراد ملّاحوں کے لباس میں تھے جبکہ باقی دو سوٹ میں ملبوس تھے۔ سوٹ میں ملبوس ایک شخص جو وِلبر رائٹ تھا اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "جہاز کو ٹریک پر سیدھا

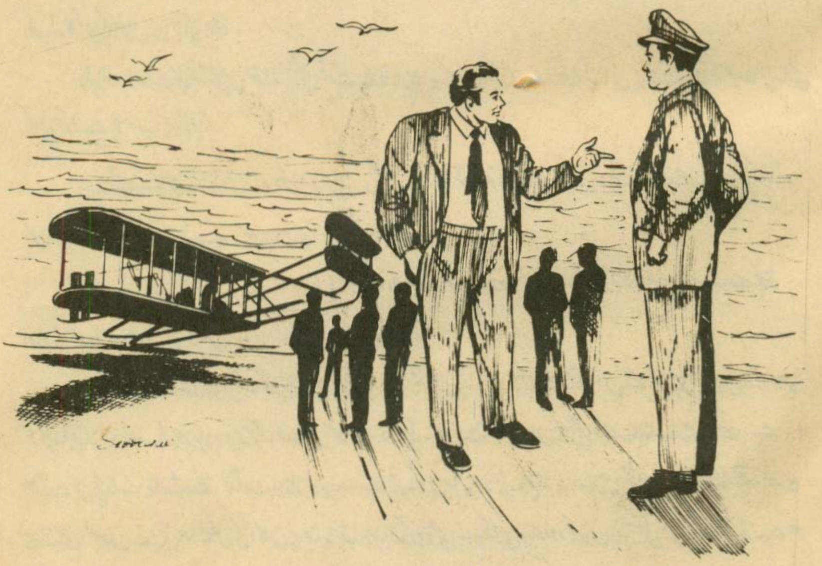

کھڑا کرو، جب تک ہم بقیہ حصّوں کو مضبوطی سے کس لیں گے۔"

"اس طوفانی ہوا میں تم اپنا یہ تجربہ کس طرح کر پاؤ گے؟" اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

"کل کا دن مناسب رہے گا کیونکہ ہوا بھی ہمارے موافق سمت میں ہوگی۔" اورول رائٹ نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں کرسمس کے موقع پر گھر میں ہونا چاہیئے۔"

انھوں نے جہاز کے مختلف حصّوں میں رسّیوں کو ایک دوسرے سے باندھا اور کھڑے ہو گئے۔ خاموشی میں صرف لہروں کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ "بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ وِلبر نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھا۔

"ٹھیک ہے، مگر کچھ کھانے سے پہلے ایک آخری کوشش کر لی جائے۔"

"وِل اب جہاز کو اُڑانے کی باری تمھاری ہے۔" اورول نے اپنے بھائی سے کہا۔

یہ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کا زمانہ تھا۔ اس دن دونوں بھائی اپنے جہاز کی ایک آزمائشی پرواز کر چکے تھے جس میں جہاز ہِلتا ڈولتا زمین سے چودہ فٹ اوپر اُٹھا تھا اور ایک سو چھبّیس فٹ کی پرواز بیس سیکنڈ میں مکمّل ہوئی تھی۔ مگر دونوں بھائیوں کی کوشش یہ تھی کہ جہاز کو مشینی قوّت سے اُڑایا جائے۔ اُن سے پہلے بہت سے لوگوں نے اس میدان میں قسمت آزمانے کی کوشش کی تھی اور بہت سے افراد نے مختلف اقسام کے گلائیڈر کے ذریعے مختلف فاصلوں کا سفر بھی طے کیا تھا۔ مگر مشینی قوّت کے ذریعے یہ کام کرنے کا کسی کو خیال ہی نہ آیا تھا۔

وِلبر اور اورول کا پختہ یقین تھا کہ مشینی قوّت کے ذریعے یہ کام ہو سکتا ہے۔ مگر لوگ اُن پر ہنستے۔ کہتے کہ "بھلا ایسا بھی کبھی ہُوا ہے جو اب ہوگا!"

جب قصبے کے لڑکے آبادی سے دُور میدان میں پتنگ اُڑاتے تو دونوں بھائی انھیں دیکھتے رہتے اور یہ سوچتے کہ پتنگ کس طرح فضا میں مُعلّق رہتی ہے۔ پھر وہ پرندوں کو بھی دیکھتے۔

"دیکھو پرندوں کو فضا کے بارے میں کوئی ایسی بات ضرور معلوم ہے جو ہم نہیں جانتے۔" وہ ایک دوسرے سے کہتے۔ اورول اور ولبر اپنے لڑکپن کے ان مشاہدات کو اب آزما رہے تھے۔

اس سے پہلے وہ خود بھی ایک گلائیڈر بنا کر اس سے سینکڑوں بار پرواز کر چکے تھے۔ اس کے بعد ہی انھوں نے سوچا کہ ایسا جہاز بنایا جائے جو زیادہ دیر تک فضا میں موجود رہ سکے۔ وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں لگے رہے۔ مختلف کَل پُرزے بنائے گئے۔ مختلف اوزار خریدے گئے۔ تب کہیں جا کر وہ ایک جہاز بنانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اور یہ جہاز بھی انھوں نے اپنی سائیکل کی دکان پر بنایا تھا۔ جہاز کی باڈی ـــ لکڑی، تار اور کینوس پر مشتمل تھی تاکہ وزن کم رہے اور

جہاز کو فضا میں بغیر کسی دشواری کے بُلند کیا جاسکے ۔ ان کی کوشش تھی کہ جہاز میں ایک آدمی کے سوار ہونے کے بعد اس کا مجموعی وزن ساڑھے سات سو پونڈ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔ جہاز میں بارہ ہارس پاور کا چار سلنڈروں والا گیسولین انجن نصب کیا گیا تھا۔ جہاز بنانے کے بعد ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ کٹی ہاک کے ساحل پر جہاز کی آزمائشی پرواز کی جائے ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ساحلی علاقہ چونکہ آبادی سے دور ہوتا ہے اس لیے زیادہ آسانی اور بغیر کسی خطرے کے جہاز کی پرواز کی آزمائش ہوسکتی ہے۔ یوں بھی نرم ریت پر گرنے کی صورت میں مُہلک چوٹ لگنے کا امکان کم ہی ہوتا ہے ۔

جہاز کی پرواز روانہ ہونے والی تھی ۔ وِلبر جہاز پر سوار ہو کر اس میں منہ کے بَل لیٹ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ وائرکس کر پکڑ لیے ۔

"اورِل موٹر اسٹارٹ کردو۔" اُس نے اپنے بھائی کو آواز دی ۔ اورِل موٹر پر جُھک گیا ۔ انجن نے دو تین جھٹکے لیے اور اسٹارٹ ہوگیا۔ جہاز کو دونوں وِنگ سے پکڑ کر کچھ لوگ دوڑے ۔ اورِل بھی جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ جہاز نے رفتار پکڑلی اور فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔

"گڈ لک وِل" اس نے زور سے کہا اور جہاز کو اُڑتا دیکھنے لگا ۔ اچانک جہاز ڈگمگایا اور اس کا رُخ اچانک زمین کی طرف ہوگیا ۔ ایک لمحے کے لیے سب کے دل لرز کر رہ گئے ۔ اورِل نے اپنی سانس روک لی ۔

"وِل بایاں وِنگ اوپر کرو" یہ سوچے بغیر کہ وِلبر کو آواز نہیں سُنائی دے گی اورِل نے اُسے ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ مگر چند لمحوں میں خود ہی جہاز کا رُخ ٹھیک ہوگیا۔ اب جہاز بڑے ہموار انداز میں محوِ پرواز تھا ۔

"ارے دیکھو تو سہی!"

"یہ تو واقعی اُڑنے لگا ہے" کچھ لوگوں نے تبصرہ کیا ۔ وہ سب مشینی قوت سے اُڑنے والے جہاز کو دیکھ رہے تھے یہ انسانی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا کہ انسان بھی پرندوں کی برابری کرنے لگا تھا۔ تیز ہوا کی وجہ سے جہاز کا ایک وِنگ جُھک گیا اور جہاز کا رُخ پھر نیچے کی طرف ہوگیا۔ وِلبر نے پوری کوشش کی کہ جہاز کو آرام سے لینڈ کرنے میں کامیاب ہو مگر پھر بھی جہاز ریت کے چھوٹے سے ٹیلے میں گھُستا چلا گیا ۔ سب لوگ جہاز کی سمت بھاگے ۔ جب وہ قریب پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ وِلبر گھِسٹتا ہوا جہاز سے باہر نکل رہا ہے ۔

"وِل تم ٹھیک تو ہو نا؟" وِلبر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں" وہ چند لمحے رُکا پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہُوا۔

"میں نے دورانِ پرواز اپنی گھڑی پر بھی نظر رکھی تھی ۔ میں نے پورے اُنسٹھ سیکنڈ کی پرواز کی ہے" اس نے پیچھے

مُڑکر دیکھا۔ کچھ اندازہ لگایا اور اچانک چلاّیا۔

"میں نے آٹھ سو فٹ سے زیادہ فاصلہ طے کیا ہے۔" خوشی سے اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ ان پانچوں ملاّحوں نے دونوں بھائیوں کے ہاتھ پکڑ کر گرمجوشی سے دبائے اور اُنھیں مبارکباد دی۔ انھوں نے آسمان پر اُڑتے ہوئے پرندوں کی طرف دیکھا پھر وِلبر کو جو ابھی ابھی ایک کامیاب پرواز کر چکا تھا۔

بشپ ملٹن رائٹ نے اپنے ہاتھ میں موجود ٹیلیگرام کو ایک بار پھر پڑھا اور مُسکرانے لگے۔ ٹیلیگرام میں اوروِل نے جہاز کی کامیاب پرواز کا پیغام دیا تھا۔

اچانک کیتھرین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی نظر باپ کے ہاتھ میں موجود ٹیلیگرام پر پڑی۔ اُس نے بھی پیغام پڑھا اور خوشی سے باپ کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

"مجھے اُن پر فخر ہے۔" بشپ ملٹن اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولے۔

"تمھیں خوشی ہوگی کیونکہ وہ لوگ..." کیتھرین نے اپنے باپ کو جُملہ بھی مکمل کرنے نہیں دیا۔ وہ دروازے کی طرف لپکی اور باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی خادمہ سے مخاطب ہوئی۔

"عُمدہ اور لذیز کھانے تیاّر کرنا شروع کر دو، کیونکہ عزّت مآب اور وِل اور وِلبر کرسمس منانے تشریف لا رہے ہیں۔"

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلۂ تحریر
اَخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

قیمت صرف ۱۰ روپے

- بُرائیوں سے برسرِ پیکار ۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے۔
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات۔
- خوبصورت اسکیچز — بہترین کتابت — اعلیٰ طباعت
- حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات۔
- — حق اسکواڈ کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوادیں۔
- — دوکاندار اور ایجنٹ حضرات آرڈر سے مُطلع کریں۔

پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

۲۷ سانپوں کے درمیان ۲۷ گھنٹے

صباحت شکیل

۲۷ سانپ کے کمرے کے باہر عام تماشائیوں اور صحافیوں کا ہجوم ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ وہ سب اس کمرے کے اندر جھانکنا چاہتے تھے اور اُن سیاہ، چتکبرے، زہریلے سانپوں کو دیکھنا چاہ رہے تھے جو کمرے کے اندر رینگ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے اُلجھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس ہجوم کو چیرتے ہوئے ایک نوجوان نمودار ہوا، اور دروازہ کھول کر نہایت اعتماد سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ دیکھنے والوں کی سانسیں ایک لمحے کے لیے اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ یہ سانپ ضرور اس نوجوان پر حملہ کرکے اُسے ڈس لیں گے۔

پُونا کا رہنے والا یہ ۲۷ سالہ نوجوان نیلم کمار تھا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ۲۷ زہریلے سانپوں کے ساتھ ۲۷ گھنٹے گزار کر ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کرے گا۔ سننے والے یہ سُن کر ہنستے۔ کیونکہ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ نیلم کمار ان خوفناک سانپوں سے محفوظ رہ سکے گا۔ ان کا خیال تھا کہ نیلم کمار جلد ہی اپنے اس اعلان سے مکر جائے گا۔ لیکن لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ دن آگیا جس کا انھیں انتظار تھا۔

مظاہرے کے دن کلکتہ سانپ گھر کے مالک نے سانپوں کو ایک ٹوکری میں رکھ کر ٹھنڈے پانی سے نہلایا اور پھر انھیں کانچ کی دیواروں والے کمرے میں آزادی کے ساتھ گھومنے کے لیے چھوڑ دیا۔ سانپ کمرے کے فرش پر رینگنے اور گھومنے لگے، ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ نیلم کمار کا انتظار کر رہے ہوں۔ نیلم کمار نے دوپہر ۳ بج کر ۵۵

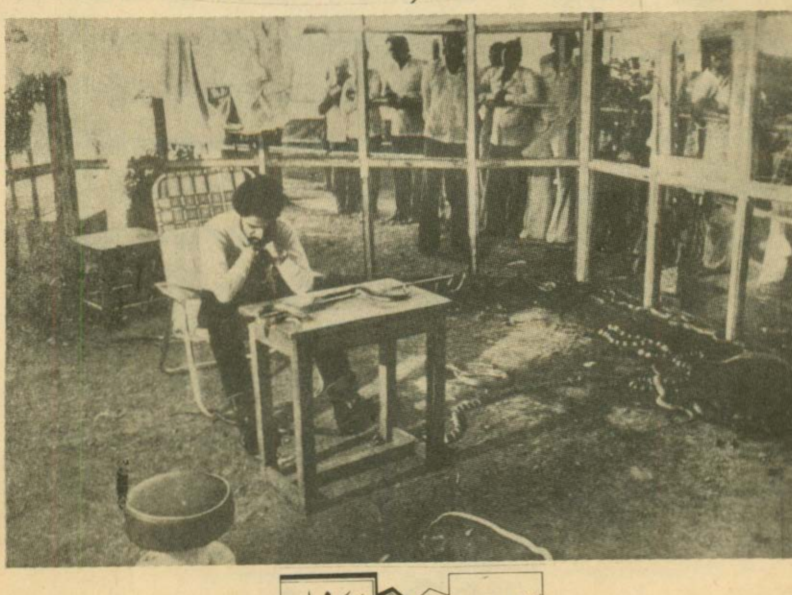

منٹ پر خطرات سے بھرے ہوئے اس کمرے میں قدم رکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی یا خوف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ جبکہ شیشے کی دیوار سے باہر تماشائی بے حد ہراساں تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جب سانپ نیلم کمار کے پیروں اور جسم سے لپٹ کر اُسے ڈسنا شروع کریں گے تو وہ نیلم کمار کی کس طرح مدد کریں گے اور کس طرح اُسے سانپوں سے نجات دلائیں گے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ نیلم کمار مزے سے چلتا ہوا، سانپوں کو پھلانگتا ہوا وہاں پہلے سے موجود کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔ کچھ ایسا تھا جیسے یہ سارے چھوٹے بڑے خونخوار سانپ اُسے پہلے سے پہچانتے ہوں اور اُن سے اس کی بڑی پرانی دوستی رہی ہو۔

نیلم کمار اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اور ۳۶ ناگ، ۱۲ کریت، ۲۴ سلیس وائپر اس کے ارد گرد رینگتے رہے نیلم کمار کے سامنے رکھی ہوئی میز پر دو ایک سانپ چڑھ گئے لیکن نیلم کمار ان سانپوں سے کھیلنے لگا۔ اس کمرے سے دور جہاں زندگی اور موت کے درمیان آنکھ مچولی ہو رہی تھی نیلم کمار کی ماں اپنے بیٹے کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ ۲۴ گھنٹے کے بعد کمرے میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ایک ناگ اور کیرت سانپ نے نہ جانے کس بات پر آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ اس لڑائی سے دوسرے سانپوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ اور اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ نہ جانے کب سانپ لڑتے لڑتے مشتعل ہو کر نیلم کمار پر حملہ آور ہو جائیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ لڑائی سانپوں ہی کی حد تک محدود رہی اور دونوں لڑنے والے سانپ ایک دوسرے کے حملوں سے زخمی ہو کر ہلاک ہو گئے۔ سانپوں کے مالک نے ان مرے ہوئے سانپوں کو باہر نکالا اور ان ہی کی نسل کے دو نئے سانپ کمرے میں چھوڑ دیے۔

اگلے دن دوپہر کے وقت جب گرمی میں شدت پیدا ہوئی تو سانپ اس سے پریشان ہو کر غصے میں آگئے اور انھوں نے پھنکارنا اور تیزی کے ساتھ کمرے میں ادھر اُدھر گھومنا اور لہرانا شروع کر دیا۔ یہ صورتِ حال بے حد تشویشناک تھی۔ چنانچہ گرمی کو کم کرنے کے لیے کمرے میں پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا۔

نیلم کمار کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان چار دنوں میں رات کا حصّہ کس طرح گزارے۔ اگر وہ سو جاتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے خود کو مکمل طور پر سانپوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ جاگتی حالت میں تو وہ اپنا بچاؤ کر بھی سکتا تھا۔ لیکن نیند کی غفلت میں وہ کیا کر سکتا تھا؟ لیکن نیلم کمار نے رات ڈیڑھ بجے سانپوں کے درمیان سونے کا خطرہ مول لیا۔ وہ ساڑھے چار گھنٹے تک سوتا رہا۔

یہ تو نیلم کمار ہی بتا سکتا ہے کہ اُسے نیند میں خوفناک خواب دکھائی دیے یا نہیں لیکن سوتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک اطمینان بھری نیند کا تاثر تھا۔ وہ اس وقت بھی نہیں جاگا جب سانپ اس کے جسم کے اوپر سے رینگتے ہوئے گزرنے لگے، سانپوں کے وہ دو ماہرین جو کمرے کی نگرانی کر رہے تھے انھوں نے بتایا کہ سوتے ہوئے نیلم کمار کے جسم

سے ۳۲ سانپ رینگتے ہوئے گزرے لیکن نیلم کمار کی آنکھ نہیں کھلی۔

انہی چھوٹے موٹے واقعات کے ساتھ جب ۲۰ گھنٹے گزر گئے اور یہ خوفناک مظاہرہ اپنے اختتام کو پہنچا تو ٹھیک سہ پہر ۳ بج کر ۵۵ منٹ پر نیلم کمار موت کے کمرے سے باہر آیا۔ باہر سانپ گھر کے مالک نے زندہ کیرت سانپ کا ایک ہار نیلم کمار کے گلے میں پہنا کر اس کا استقبال کیا اور اس کامیاب مظاہرے پر اُسے مبارک باد دی۔ نیلم کمار کی والدہ نے اسے زندہ سلامت دیکھ کر گلے لگا لیا۔

یہ مظاہرہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ بہت سے لوگوں کو اس کا یقین ہی نہیں آیا۔ انھوں نے اس پر طرح طرح کے تبصرے کیے۔ کسی نے کہا کہ ان سانپوں کا زہر نکال دیا گیا تھا۔ کسی نے خیال ظاہر کیا کہ نیلم کمار نے سانپوں کو ہپناٹائز کر لیا تھا۔ کسی نے کہا کہ سانپ پالتو تھے۔ نیلم کمار نے ان تبصروں پر مُسکراتے ہوئے اعلان کیا کہ جو شخص ان الزامات کو ثابت کرے گا اُسے دس ہزار روپے انعام میں دیے جائیں گے۔

لیکن افسوس کہ باتیں بنانے والوں میں سے کسی میں اتنی ہمّت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ ان الزامات کو ثابت کر سکے۔

نیلم کمار کے اس مظاہرے سے تقریباً ایک سال پہلے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں پیٹر سیلمین نام کے ایک شخص نے ۱۸ زہریلے اور ۶ نیم زہریلے سانپوں کے ساتھ پچاس دن گزارنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا لیکن وہ ہر ۲۴ گھنٹے بعد آرام کرنے آدھے گھنٹے کے لیے کمرے سے باہر آجاتا تھا۔ نیلم کمار نے اپنے اس مظاہرے کے لیے پیٹر سیلمین سے چار گنا زیادہ سانپ جمع کیے تھے۔ اور نیلم کمار کا کمرہ ناپ کے اعتبار سے پیٹر کے کمرے سے صرف چار فیصد بڑا تھا اور پھر نیلم کمار مظاہرے کے دوران ایک گھنٹے کے لیے بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ سانپوں کے ماہرین نے ان دونوں مظاہروں میں پیٹر سیلمین اور نیلم کمار کو بالا ترتیب ۹۰۰ اور ۱۵۱۲ نمبر دیے۔۔۔ نیلم کمار نے اس پر بے حد دلچسپ تبصرہ کیا۔ اس نے کہا کہ اس نے کوئی عالمی ریکارڈ نہیں توڑا بلکہ ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔

نیلم کمار سے جب پوچھا گیا کہ انھیں سانپوں سے کب اور کیسے دلچسپی پیدا ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ایک بار جب وہ اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے تو ایک سانپ رینگتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ نیلم نے سانپ کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اُسے لے کر منیجر کے پاس گئے۔

منیجر نے سانپ دیکھا تو گھبرا کر بولا "یہ تو بہت زہریلا سانپ ہے"۔ نیلم کا کہنا ہے کہ بس اُسی دن سے سانپوں کے ساتھ اُس کی دوستی شروع ہوئی۔

اس وقت نیلم کمار نے اپنے گھر کے پچھلی جانب احاطے میں بہت سے سانپ پال رکھے ہیں۔ سانپوں میں ایک اجگر اور ڈیڑھ سو مختلف نسل کے سانپ موجود ہیں۔

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں

ماہ وش شکیل

انسان بھی کیا خوب مخلوق ہے۔ اگر اس پر تخریبی خیالات کا غلبہ ہو جائے تو یہ مفید سے مفید چیز کو بے کار بنا دیتا ہے اور اگر وہ اپنی تعمیری قوّتوں کو کام میں لائے تو بے کار سے بے کار چیز کو انتہائی مفید بنا دیتا ہے۔

اب ذرا آپ بھالو کی اس تصویر کو غور سے دیکھئے۔ لگتا ہے جیسے یہ بھالو صاحب ابھی اگلے لمحے خوں خوں کرتے ہوئے صفحے سے باہر آجائیں گے اور اگر یہ نِرے جنگلی ہیں تو آپ کو کاٹ کھائیں گے اور اگر یہ پالتو قسم کے بھالو ہیں تو یہ طرح طرح کے کرتب دکھا کر آپ کا دِل بہلائیں گے۔ اور ذرا تن کر کھڑے ہوئے مُرغ میاں کو دیکھئے، لگتا ہے جیسے یہ اپنے کسی دشمن مُرغے پر دوڑ کر جھپٹنے ہی والے ہیں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بھالو اور مُرغے کے یہ اجسام کس چیز سے بنائے گئے ہیں؟

جناب بھالو اور مرغے کے یہ جسم کمپیوٹر کے مختلف چھوٹے چھوٹے ناقابلِ استعمال ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ جیسے کمپیوٹر چپس، ٹرانزسٹر، الیکٹرونک کینکٹر وغیرہ، البتہ بھالو کی داڑھی اور مُرغے کی دُم کمپیوٹر میں استعمال ہونے والی تار سے بنائی گئی ہے۔

کمپیوٹر کے ان غیر اہم اور بے جان ٹکڑوں کو جوڑ کر یہ بولتے ہوئے جسم امریکی ریاست کے رہنے والے ایک آرٹسٹ جو وِینو نے تیار کیے ہیں۔ وینو نے ان جسموں کے علاوہ شیر کے ایک خاندان اور کنگارو کے اجسام بھی بنائے ہیں۔ وِینو نے جسموں کے یہ نمونے دراصل ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں ایک اشتہاری کمپنی کے لیے بنائے تھے جس نے اِن اجسام کو اپنی بنائی ہوئی اشیاء کو متعارف اور مشہور کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وِینو نے ان اجسام کو تیّار کرنے کے لیے پہلے ایک پلاسٹک فوم پر ان جانوروں کی تصاویر بنائیں اور پھر کمپیوٹر کے ان ٹکڑوں کو ان تصاویر پر فِٹ کر دیا۔ اور یوں اس کے بنائے ہوئے یہ اجسام کمپیوٹر دور کے آرٹ کا ایک خوبصورت نمونہ بن گئے۔

دیکھا آپ نے! وینو صاحب نے کمپیوٹر کے ناکارہ ٹکڑوں کو استعمال میں لا کر انھیں کیا سے کیا بنا دیا۔ وینو صاحب کے اس کارنامے سے جہاں اُن کی ذہانت اور حُسنِ تدبیر کا پتا چلتا ہے۔ وہیں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ دُنیا کی کوئی چیز بھی بے مصرف نہیں ہوتی۔

ذرا غور کیجئے کہ ہم ہر روز کتنی ساری چھوٹی چھوٹی چیزوں کو استعمال کر کے کوڑے دان کی نذر کر دیتے ہیں۔ مثلاً کریم، پالش، دوائی، دودھ اور بہت ساری چیزوں کی بے شمار چھوٹی بڑی خالی شیشیاں، ڈبے وغیرہ۔ اگر ہم ان چیزوں کو کام میں لے آئیں تو یہ ہمارے لیے کتنی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

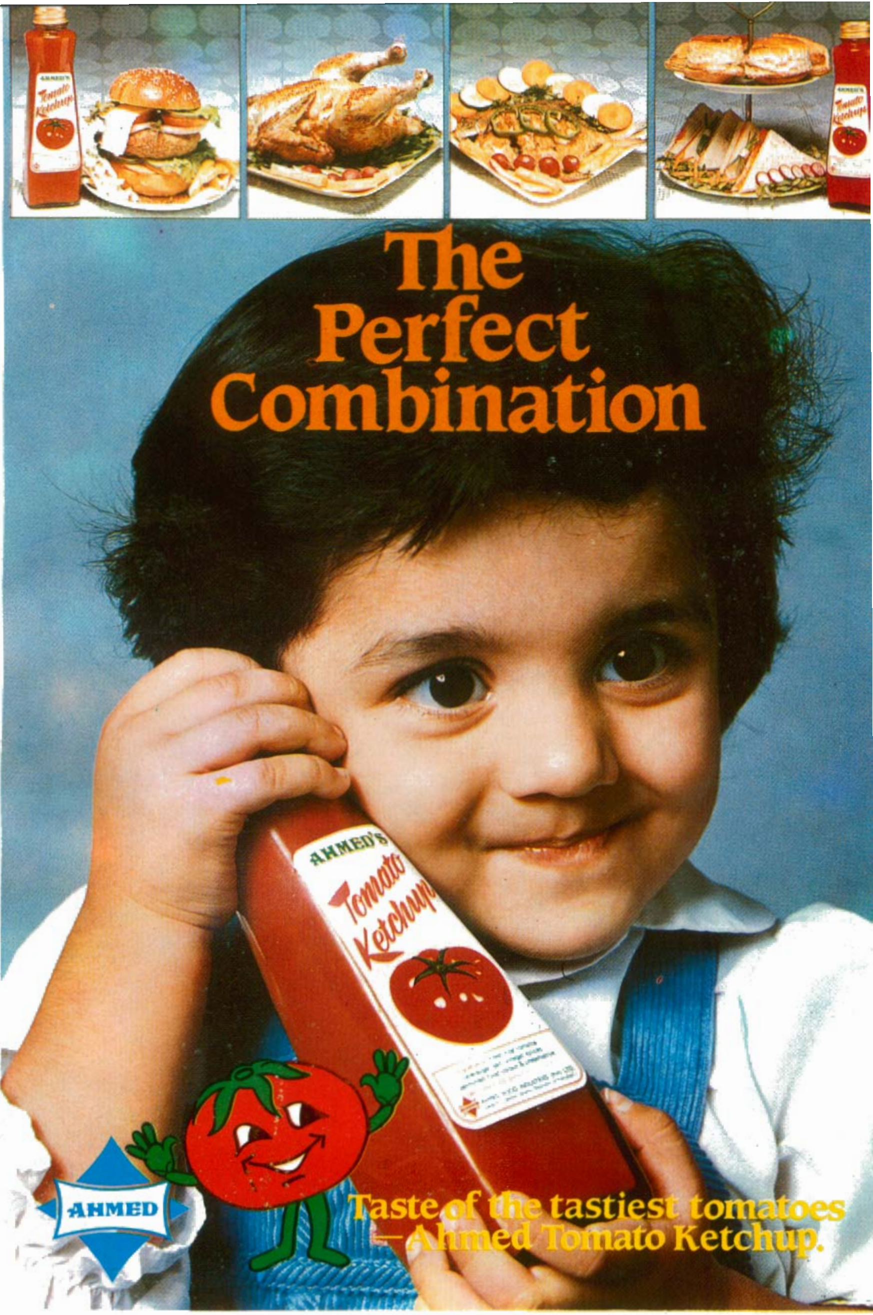
The Perfect Combination
AHMED'S
Tomato Ketchup
AHMED
Taste of the tastiest tomatoes
—Ahmed Tomato Ketchup.

ستیہ جیت رے
ترجمہ: آصف فرخی

تلاش

قسط نمبر 1

بچپن میں آنکھ مچولی کا کھیل کتنا مزیدار معلوم ہوتا ہے۔ ایک بچہ چھپ جاتا ہے، اور ایک بچہ اُسے ڈھونڈتا ہے۔ جس بچے کے ذمّے ڈھونڈنا ہوتا ہے، وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، ہر جگہ نظر دوڑاتا ہے، کونے کھدروں میں اور نامعلوم جگہوں میں تلاش کرتا ہے، کہ کہیں ایک ذرا سی جھلک نظر آجائے اور وہ چھپے ہوئے کو پکڑنے اور جو بچّہ چھپا ہوا ہوتا ہے، اس کا دل زور زور سے دھڑکتا رہتا ہے کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں، سب کی نظروں سے چھپ کر کسی ایسی خفیہ جگہ میں بیٹھے رہنا، خود معلوم ہو تا کہ میں کہاں ہوں اور دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہنا، اس سب سے

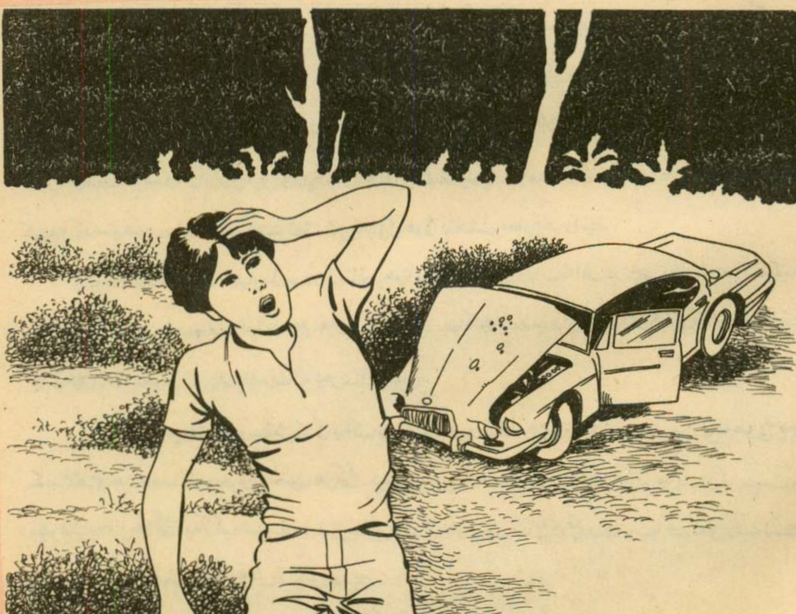

کتنا عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں سب کو دیکھ سکتا ہوں، مجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

کبھی اگر یہ کھیل سچ مچ الٹ ہو جائے تو کیسا ہو؟ ایسی آنکھ مچولی ہو کہ چھپنے والے کو سب دیکھ لیں، لیکن وہ خود اپنے آپ کو نہ دیکھ سکے، سب اُسے ڈھونڈ بھی لیں، لیکن وہ اپنے آپ کو تلاش نہ کر سکے۔ چھپنے والا خود اپنی نظروں سے اوجھل ہو جائے، اگر کبھی ایسا ہو جائے تو کیا ہو؟ اس ناول میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آتا ہے۔ ایک لڑکے کی آنکھ کھلتی ہے تو اُسے نہ پیڑوں کے نام یاد ہیں، نہ جگنوؤں کے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ جس جگہ بہت سے پیڑ ہوں اس کو کیا کہتے ہیں اور جب بہت سے جانور ایک ساتھ ہوں تو اُسے کیا کہتے ہیں۔ اسے تمام چیزوں کے نام بھول گئے ہیں۔ حد تو یہ ہے اُسے اپنا نام بھی یاد نہیں۔ کوئی جب اس سے اس کا نام پوچھتا ہے، تو وہ یوں ہی جھوٹ مُوٹ اپنا ایک نام بتا دیتا ہے، لیکن ہر نام کی ایک کہانی ہوتی ہے۔ جُوں ہی وہ اپنا نیا نام رکھ لیتا ہے، ایک تماشا شروع ہو جاتا ہے۔ انوکھا اور اچھوتا تماشا۔ اس میں کون تماشا ہے، کون تماشائی اور کون تماشاگر؟ یہی اس کہانی کی تلاش ہے۔

یہ کہانی ستیہ جیت رے نے لکھی ہے۔ جو دنیا بھر میں اپنی بنائی ہوئی فلموں کے لیے مشہور رہے ہیں، لیکن ان کی فلمیں پاکستان و ہندوستان میں بننے والی عام فلموں کی طرح نہیں ہوتیں۔ رے کی فلموں میں ایک اعلیٰ مقصد ہوتا ہے۔ سنجیدگی ہوتی ہے اور یہ اُتنی ہی مفید ہوتی ہیں جتنی کوئی اچھی کتاب ہو سکتی ہے۔ ستیہ جیت رے ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان کے شہر کلکتہ میں رہتے ہیں اور اسی شہر کے پسِ منظر میں انہوں نے یہ ناول بھی لکھا ہے۔ رے کی بنائی ہوئی فلموں کو بہت سے بین الاقوامی انعامات بھی مل چکے ہیں۔ اُن کا شمار دنیا کے بڑے فلم سازوں میں ہوتا ہے اور جب بھی اس دور کے بڑے فنکاروں کا ذکر ہوتا ہے، اس میں ستیہ جیت رے کا نام بھی شامل ہوتا ہے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ایک ہیں۔ جنھوں نے فلم کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے تسلیم کروایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ستیہ جیت رے کی فلم سلولائیڈ پر تخلیق کی ہوئی نظم معلوم ہوتی ہے

ایک فن کار کا فن کتنے روپ بدل بدل کر ظاہر ہوتا ہے۔ ستیہ جیت رے اعلیٰ درجے کے فلم ساز ہونے کے ساتھ ساتھ بچّوں کے جانے پہچانے مصنّف بھی ہیں۔ بچّوں کے لیے لکھے جانے والے ان کے ناول لاکھوں کی تعداد میں پڑھے جاتے ہیں۔ وہ بچوں کے لیے ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔

اپنے نام سے بچھڑے ہوئے لڑکے کی یہ کہانی پاٹھک چند کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ چھپنے کے ساتھ ہی ہندوستان بھر میں مقبول ہو گئی۔ پھر اس پر سندیپ رے نے فلم بنائی تو اس کہانی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہو گئی۔ یہ کتاب اس سے پہلے برِ صغیر کی کئی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اب اسے تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ اُردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کی آنکھ کھُل گئی تھی، کب یہ تو اسے معلوم نہیں ہُوا، لیکن اُسے کچُھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ گیلا تھا۔ اس کے بدن کے نیچے گھاس تھی اور سر کے نیچے کوئی سخت چیز اور اُسے بہت درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا سارا بدن دُکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنا بازو اٹھایا اور یہ جانتے ہوئے کہ اس میں درد ہوگا، بہت دھیرے سے اوپر کیا اور سر کے نیچے ٹٹول کر دیکھا۔ اس کا سر ایک پتھر پر ٹکا ہوا تھا۔ پتھر بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ ہِلایا نہیں جاسکتا تھا۔ کیا وہ اپنا سر اس پر سے ہٹا سکتا تھا؟ اور یہی اس نے کیا۔ اب وہ زمین پر بالکل سیدھا لیٹ گیا۔

اب وہ دیکھ سکتا تھا۔ اس سے پہلے وہ یُوں نہیں دیکھ پا رہا تھا کہ رات کا وقت تھا اور وہ کھُلے آسمان تلے پڑا ہُوا تھا۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے۔ بادل اُڑتے چلے جاتے تھے، اور ستارے جو ایک ایک کرکے نکل رہے تھے، چمکنے لگے تھے،

اُس نے اندازہ لگانا چاہا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھنے کی کوشش کرے، اُسے یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اُسے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ گھاس پر کیوں پڑا ہے، کس وجہ سے اس کا سارا بدن دُکھ رہا ہے اور سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے۔

یہ آواز کیسی تھی؟ یہ آئے چلی جا رہی تھی۔

اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ جھینگر۔ یہ جھینگروں کے بولنے کی آواز تھی۔ کیا جھینگر گاتے ہیں؟ نہیں، جھینگر گاتے نہیں ہیں۔ وہ کیڑے ہوتے ہیں، چڑیاں نہیں۔ یہ اُسے معلوم تھا۔ کیسے معلوم ہوا؟ کس نے بتایا تھا، اُسے یاد نہ آیا۔

اُس نے گردن کو ذراسی جُنبش دی تو اُس کا سر دُکھنے لگا۔ کوئی بات نہیں۔ وہ گردن گھمائے بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرے گا۔ اسے لازمی طور پر یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اس وقت، اس جگہ پر کیوں موجود ہے؟

وہ وہاں چمکنے والی چیزیں کیا تھیں؟ کیا آسمان سے ستارے نیچے اُتر آئے تھے؟

نہیں۔ اُسے یاد آیا۔ جگنو۔ جگنو اندھیرے میں جگمگاتے ہیں اور اُڑتے پھرتے ہیں۔ جگنوؤں کا اُجالا ٹھنڈا ہوتا ہے جگنو کو اگر پکڑ کر مُٹھی میں بند کرلو تو گرم نہیں ہوتا۔ کس نے اُسے بتایا تھا یہ؟ اسے یاد نہ آیا۔

جگنوؤں کا مطلب تھا پیڑ۔ جگنو پیڑوں میں دَمکتے ہیں۔ وہاں پر بہت سارے تھے، کچُھ پاس، کچُھ دور، کچُھ بہت دُور۔ تو یہاں بہت سارے پیڑ ہوں گے۔ جس جگہ بہت سارے پیڑ ہوتے ہیں، اُسے کیا کہتے ہیں؟ اُسے یاد نہ آیا۔

اُس نے اپنا سر دوسری طرف کرلیا۔ سر میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

اس طرف بھی بہت سارے پیڑ تھے اور بہت سے جگنو بھی۔ پیڑوں کی پھُننگ آسمان کے اندھیرے میں گھُل مِل گئی تھی۔ ستارے چمک رہے تھے اور اپنی جگہ قائم تھے۔ ان میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ جگنو اِدھر سے اُدھر دَمکتے پھر رہے تھے۔ اس جانب کے پیڑ زیادہ دُور تھے۔ اِن کے سامنے سڑک تھی۔ یہ سڑک پر کیا تھا؟ اُس نے اسے پہلے تو نہیں دیکھا تھا

اب اس نے دیکھا۔

گاڑی۔ سڑک پر گاڑی کھڑی تھی۔ نہیں، وہ کھڑی نہیں تھی۔ وہ ایک طرف کو جُھک گئی تھی۔ گاڑی کا پچھلا حصّہ اس کی جانب تھا۔

یہ گاڑی کس کی تھی؟ کیا وہ بھی اس میں تھا؟ کیا وہ کہیں جا رہا تھا؟ اُسے نہیں معلوم تھا۔ اسے یاد نہ آیا۔

اس گاڑی کو دیکھنے سے نہ معلوم کیوں وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ گاڑی وہاں تھی، وہ یہاں۔ آس پاس کوئی نہیں تھا، کوئی چیز نہیں تھی۔ گاڑی ایک طرف کو جُھک رہی تھی۔ دُور دُور تک کوئی اور آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گاڑی کی پُشت اس کی طرف تھی۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اُٹھے گا تو تکلیف ہوگی۔ پھر بھی اُس نے کوشش کی، اور گِر پڑا۔ اُس نے ایک بار پھر کوشش کی احتیاط کے ساتھ، ہمّت کے ساتھ، اور اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو ہی گیا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گاڑی سے دُور اور پیڑوں کے نزدیک آنے لگا۔

جنگل۔ ہاں، ایک جگہ بہت سے پیڑ ہوں تو اُسے جنگل کہتے ہیں۔ اب اُسے یاد آیا۔ ابھی تک رات تھی، اندھیرا چھایا ہوا تھا، مگر اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جنگل میں ہے۔ اب وہ تھوڑا تھوڑا سا دیکھ بھی سکتا تھا۔ ستاروں کی روشنی میں دُھندلا سا نظر تو آتا ہے۔ چاند ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ چمکیلا ہوتا ہے، اور سورج تو ساری دنیا پر اپنی روشنی پھیلا دیتا ہے۔

وہ پیڑوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے چوتھے پیڑ کے سامنے رُک گیا۔ وہاں اس کے سامنے کوئی ایسی چیز تھی جو پیڑ نہیں تھی، اور وہ اس کے بہت نزدیک تھا۔ وہ پیڑ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور سَر نکال کر جھانکنے لگا کہ یہ چیز کیا ہے۔

جانوروں کا ریوڑ۔ وہ سب ساتھ ساتھ چل رہے تھے، اور ان کے چلنے سے نرم نرم سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ اب جھینگروں کی آواز سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ جانوروں کی آہٹ الگ پہچان سکتا تھا۔ کیا ان کے سینگ بھی تھے؟ اس نے ایک کو دیکھا۔ پھر ایک اور کو۔ پھر ایک اور کو۔ ہرن۔ تو یہ جانور ہرن تھے۔ اُسے یاد آیا۔ ان ہرنوں میں سے ایک ہرن اچانک رُک گیا۔ اور سر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ دوسرے ہرنوں نے بھی یہی کیا۔ وہ سُن رہے تھے۔

اس نے بھی سُنا۔ گاڑی کی آواز تھی۔ یہ آواز دُور سے آ رہی تھی، پاس آتی جا رہی تھی۔

ہرن چوکڑی بھر کر بھاگ گئے۔ ابھی یہاں تھے اور ایک لمحے میں غائب۔ سب ایک ساتھ۔

گاڑی پاس آتی جا رہی تھی۔ اب وہ بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ پیڑوں کے پیچھے آسمان پر اُجالے کے آثار تھے۔ ستارے دُھندلا گئے تھے۔

وہ پیچھے مُڑا، اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا سڑک کی طرف رُخ کیا۔ اس اُمید پر کہ شاید وہ آنے والی گاڑی کو دیکھ لے۔

مگر اس کی ٹانگوں میں بہت درد ہو رہا تھا اور اُسے لنگڑانا پڑ رہا تھا۔

گاڑی گزر گئی۔ یہ ٹرک تھا۔ ہرے رنگ کا 'اوپر تک سامان سے بھرا ہوا ٹرک۔ سڑک پر کھڑی ہوئی اور ایک طرف کو جھکی ہوئی اُس گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹرک نے اپنی رفتار کچھ کم کی' لیکن رُکا نہیں۔

وہ اپنے آپ کو بہت مشکل سے گھسیٹ کر سڑک تک لے آیا۔ اب وہ بالکل صاف دیکھ سکتا تھا۔ آسمان کا اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ گاڑی کے سامنے والا حصّہ بالکل تباہ تھا۔ اوپر کا حصّہ کھل گیا تھا۔ سامنے کا دروازہ لٹک رہا تھا۔ اسے بال نظر آئے۔ کسی آدمی کے بال۔ اُس آدمی کا سَر اس کھلے ہوئے دروازے میں سے جھول رہا تھا۔ وہ اُلٹا پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر نے نیچے سڑک کی مٹی گیلی نظر آ رہی تھی۔

ایک اور آدمی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑا ہُوا تھا۔ اس کی ٹانگ گاڑی کی کھڑکی میں سے نظر آ رہی تھی۔ اس کی پتلون کالی تھی۔ گاڑی کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ گاڑی کے اردگرد سڑک پر شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ شیشے کے ہر ٹوٹے ہوئے ٹکڑے میں آسمان جھلک رہا تھا۔ آسمان اب روشن ہو چکا تھا۔

جھینگر اب چُپ ہو گئے تھے۔ ایک چڑیا کی آواز آئی۔ تین مرتبہ۔ سیٹی جیسی آواز۔

اس نے ایک بار پھر گاڑی کی طرف دیکھا اور اس کا دِل خوف سے بھر گیا۔ سڑک پر پڑے ہوئے شیشے اور خون کے سُرخ دھبّوں نے اُسے ڈرا دیا۔ اور تو کہیں سُرخ دھبّے نہیں تھے۔ ہاں، تھے اس کے کپڑوں، موزوں اور ہاتھوں پر سُرخ دھبّے تھے۔ وہ اس جگہ اب نہیں رہے گا۔ اس کے سامنے آگے تک سڑک بل کھاتی جا رہی تھی اور ایک ایسے مقام پر جا کر ختم ہو گئی تھی، جہاں زمین کھلی کھلی نظر آ رہی تھی۔

وہ جنگل کے آخری کنارے تک پیدل چل پڑا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ وہاں تک پہنچ کر ہی دم لے گا۔ وہ اتنا زخمی تو نہیں ہوا ہے۔ وہ دونوں آدمی۔ وہ شاید مَر چکے ہیں۔ بس اگر وہ اپنے آپ کو مجبور کرے کہ لنگڑائے بغیر چل سکے اور سر میں اُٹھنے والے درد کی لہریں تھم جائیں اور کہنی کا زخم بھر جائے، تو وہ ہر اُس آدمی سے، جو اس کا حال پوچھے گا، یہ کہہ سکے گا! بالکل ٹھیک ہے، جناب آپ کی مہربانی۔

وہ یہ سمجھ نہیں پایا کہ اُسے اس سے پہلے کی کوئی چیز کیوں یاد نہیں آ رہی جب اس کی آنکھ کھلی تھی اور اُس نے اپنے آپ کو ستاروں بھرے آسمان کی جانب تکتے ہوئے پایا تھا۔ اُسے اپنا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اُسے بس اتنا معلوم تھا کہ تباہ حال گاڑی اس کے پیچھے سڑک پر کھڑی تھی اور اس میں دو آدمی تھے جو بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جنگل میں ہے، اس کے پیروں کے نیچے گھاس ہے، اس کے سر کے اوپر آسمان سُرخ ہو چلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سورج نکلنے ہی والا ہے، اس لیے یہ وقت صبح کا ہو گا۔

وہ چلتا رہا۔ فضا میں چڑیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اب وہ پیڑوں کو دیکھ سکتا تھا، ان کے نام بتا سکتا تھا، یہ برگد ہے، یہ آم اور یہ نیم۔ وہ والا پیڑ کون سا تھا؟ کیا یہ امرود تھا؟ ہاں۔ اس کی ٹہنیوں سے امرود لٹک رہے تھے۔

امرودوں کو دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی۔ وہ سڑک سے اُتر کر لنگڑاتا ہوا پیڑ کے پاس آیا۔ آم کے پیڑ پر بھی پھل آیا ہوا تھا مگر ٹانگوں کے درد کی وجہ سے وہ اس پیڑ پر چڑھ نہیں سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے امرود دسترس میں تھے، اس نے ایک کھایا، پھر دوسرا۔

جنگل سے آگے سڑک ایک بڑی شاہراہ سے جا ملی۔ اب وہ کدھر جائے؟ اُسے معلوم نہیں تھا۔ وہ سیدھے ہاتھ پر مڑا اور چلتا ہی رہا یہاں تک کہ وہ ایک پیڑ کے پاس آیا جس کا نام اُسے معلوم نہیں تھا اور اس کے سائے میں تھک کر ڈھیر ہوگیا۔ پیڑ کے تنے کے گرد سیاہ اور سفید حلقے بنے ہوئے تھے۔ جہاں تک وہ دیکھ سکتا تھا، سیاہ اور سفید حلقے سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے پیڑوں پر بنے ہوئے تھے۔ وہ حیران ہوگیا۔ یہ حلقے بھلا کوئی کیوں بنائے گا؟ اس سوال کا کوئی جواب اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

وہ اب کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا اس کا سَر درد کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگے اور چہرے کے اعصاب کانپنے لگے۔

اس نے لمبا سانس لیا تو دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ اس کے اگلے ہی لمحے یہ سیاہ اور سفید حلقے، پیڑ، سڑک سبز اور زرد رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہوئے، دھندلے پڑے اور غائب ہوگئے۔

ایک سر اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا، اور ہل رہا تھا۔ اس سر کے اوپر پگڑی تھی اور داڑھی نہیں۔ وہ خود ہل رہا تھا، سر نہیں ہل رہا تھا۔ پگڑی اور داڑھی والا اُسے ہلا رہا تھا۔

"دودھ، لڑکے۔ گرم دودھ۔ اسے پی لو۔"

اس آدمی کے ہاتھ میں گلاس سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

وہ سامان سے بھرے ہوئے ٹرک کے پچھلے حصّے میں پڑا ہوا تھا، ٹرک کے دروازے اور سامان کے درمیان۔ وہ شیشوں پر پڑا ہوا تھا اور کپڑوں کی گٹھڑی اس کے لیے تکیے کا کام دے رہی تھی۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دودھ پینے لگا۔ ٹرک، سڑک کے کنارے بنے ہوئے ڈھابے کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ باہر تین آدمی لکڑی کے بنچ پر بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

ڈھابے سے آگے بنی ہوئی دکانوں میں سے کسی ایک میں سے ٹھونکا پیٹی کی آواز آرہی تھی۔ مرمّت کی دکان ہوگی۔

سامنے کالے رنگ کی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے برابر ایک آدمی کھڑا، رومال سے چشمہ صاف کر رہا تھا۔ وہ قمیض پتلون پہنے ہوئے تھا۔

پگڑی والا آدمی ڈھابے کے اندر جا کر واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے چائے پینے والے تینوں آدمی بھی آ گئے۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" اس نے ہندی میں پوچھا۔

دودھ آدھا رہ گیا تھا۔ دودھ اچھا تھا، بہت مزے کا۔

"مجھے نہیں معلوم؟ کیا مطلب؟ تم بنگالی ہو؟"

اُس نے سَر ہلایا۔ وہ بنگالی تھا۔ اتنا تو یقین تھا۔ وہ یہ ساری باتیں بنگالی ہی میں تو سوچ رہا تھا!

"تم کہاں سے آئے ہو؟ تمھارے چوٹ کیسے لگی؟ تمھارے ساتھ اور لوگ بھی تھے؟ کہاں گئے وہ"؟

"معلوم نہیں یاد نہیں"

"بات کیا ہے؟ کون ہے یہ لڑکا؟"

کالی گاڑی کے پاس جو آدمی کھڑا ہوا تھا، وہ اِدھر آ گیا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی پھر بھی اس کے سَر پر بال کم تھے۔ اس نے بہت غور سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ پگڑی والے آدمی نے اُسے ہندی میں سمجھایا۔ بات بہت سیدھی سادی تھی۔ اس نے لڑکے کو سڑک کے کنارے بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا، اُسے اُٹھا لیا، ٹرک میں لٹایا اور اسے یہاں لے آیا۔ اگر لڑکا کلکتہ کا رہنے والا ہے تو وہ اسے شہر تک لے جائے گا۔

"تمھارا کیا نام ہے؟" گاڑی والے نے پوچھا۔ وہ آدمی بھی بنگالی تھا۔

مصیبت! وہ اپنا نام بھول چکا تھا۔ اُسے پھر دُہرانا پڑا کہ اُسے اپنا نام معلوم نہیں ہے۔ پگڑی والا آدمی زور سے ہنس پڑا، اور کہنے لگا۔

"نہیں معلوم، نہیں معلوم۔ بس یہی کہے جاتا ہے"

"کیا مطلب کہ تمھیں نہیں معلوم؟ کیا تم بھول گئے؟"

"ہاں"۔

گاڑی والے آدمی نے اس کی کُہنی کے زخم کو دیکھا۔

"تمھارے کہیں اور بھی چوٹ لگی ہے؟"

لڑکے نے اپنے چِھلے ہوئے گھٹنے دکھائے۔

"سر پہ بھی لگی ہے؟"

"ہاں"۔

"مجھے دکھاؤ اپنا سر نیچے کرو"۔

وہ جھک گیا، اور جب اس آدمی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے سُوجی ہوئی چوٹ کو ہاتھ لگا دیا تو اس کے سارے بدن میں جھُرجھُری سی دوڑ گئی۔

"یہاں زخم معلوم ہوتا ہے۔ تمھارے بال خون سے چپکے ہوئے ہیں۔ تم نیچے اُتر سکتے ہو؟ آؤ۔ کوشش کرو"۔

اس نے دودھ کا گلاس پگڑی والے آدمی کو پکڑا دیا، ٹانگیں نیچے لٹکائیں اور بازو آگے پھیلا دیے۔ اس آدمی نے اُسے بہت آہستہ سے، کہ کہیں تکلیف نہ ہو، اُسے ٹرک سے اُتار دیا۔ پھر اُس نے ٹرک والے سے کوئی بات کہی۔ کھڑگ پور یہاں سے تیس میل دور تھا۔ وہ لڑکے کو وہاں کے دواخانے لے جائے گا اور ڈاکٹر سے مرہم پٹّی کروائے گا۔ پھر وہ اُسے کلکتے لے جائے گا، جو اس کی بھی منزل تھی۔

"پہلے پولیس اسٹیشن جاؤ"۔ ٹرک والے نے مشورہ دیا۔ "مجھے تو کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے"۔

ان کی باتیں سمجھنے میں لڑکے کو کچھ وقت لگا۔ اس نے پولیس کا لفظ سُنا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پولیس تو چوروں کو پکڑتی ہے اور انھیں سزا دیتی ہے۔ اُسے تو احساس نہیں تھا کہ اُس نے کوئی چیز چُرائی ہے۔

وہ آدمی اپنی گاڑی خود چلا رہا تھا۔ اُس نے لڑکے کو اپنے برابر بٹھا لیا۔ جلد ہی وہ دکانیں پیچھے رہ گئیں۔ وہ کھُلے علاقے میں آگئے۔ لڑکے کو احساس ہوا کہ آدمی اُسے کن انکھیوں سے دیکھ رہا ہے۔ ذرا ہی دیر میں وہ دوبارہ اس سے سوال پوچھنے لگا۔

"کیا تم کلکتہ میں رہتے ہو؟"

"معلوم نہیں"۔ اُسے جواب دینا پڑا۔

"اور تمھارے والدین؟ کیا وہ تمھیں یاد نہیں؟ بھائی بہن؟"

"نہیں"۔

پھر اس نے پچھلی رات کے واقعات دہرائے اور اسے اس ٹوٹی ہوئی گاڑی اور ان دو آدمیوں کے بارے میں بتایا۔

"کیا تم نے گاڑی کا نمبر دیکھا تھا؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"نہیں"۔

"کیا تمھیں یاد ہے کہ ان آدمیوں کی شکل کیسی تھی؟"

اسے جتنا یاد تھا، اس نے بتا دیا۔ اس آدمی نے اور کوئی سوال نہیں پوچھا، لیکن سارے راستے اس کے ماتھے پر گہری

شکن پڑی رہی۔

دو بجے کا وقت تھا۔ اس آدمی کی گھڑی کی طرف دیکھنے سے اسے معلوم ہوا۔ دو امرود اور ایک گلاس دُودھ اس کا پیٹ بھرنے کے لیے ناکافی تھے۔ اور وہ بھوکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ان صاحب کو بتا دے لیکن اُسے بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انھوں نے خود ہی گاڑی پیڑ کے سائے میں کھڑی کردی۔ پاس ہی ایک پتّھر پر لکھا ہوا تھا، کھڑگ پور بارہ میل، انھوں نے سفید رنگ کا ایک ڈبّہ کھولا، سالن اور پیچیاں نکالیں، اسے بھی دیں اور خود بھی کھانے لگے۔ پہلے تو اُسے یاد نہیں آیا کہ یہ سفید اور گول چیز کیا ہے، مگر اُس نے آسمان پر اُڑنے والی چیلوں کی طرف دیکھا اور اُسے یاد آگیا کہ چیل اور پیچی کے نام ملتے جُلتے ہیں۔

پتّھروں پر لکھے ہوئے ہندسے بارہ سے گھٹ کر دو رہ گئے اور کھڑگ پور کا شہر نظر آنے لگا۔

"کیا تم پہلے کبھی کھڑگ پور آئے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

اب بھلا اُسے کیا یاد تھا کہ وہ یہاں آچکا ہے کہ نہیں۔ اس جگہ کا نام بھی اجنبی تھا اور وہ دیکھنے سے بھی مانوس نہیں لگتی تھی۔

"یہاں بہت بڑا کالج ہے" انھوں نے اُسے بتایا "اس کا نام آئی آئی ٹی ہے۔"

یہ حروف اس کے ذہن میں کچھ دیر تک گول گول گھومتے رہے، پھر سڑکوں کے شور میں گُم ہوگئے۔

ایک چوراہے پر سپاہی کو کھڑا دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا اور اس نے بڑی مشکل سے کہا: "مجھے پولیس کے سپاہی اچھے نہیں لگتے۔"

"پولیس کو بتانا پڑے گا۔" انھوں نے کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ تم کسی اچھے خاندان کے ہو۔ تم تو اپنے ماں باپ کو بھُول گئے مگر وہ تم کو نہیں بھُولے ہوں گے۔ ہمیں پولیس سے معلوم کرنا پڑے گا کہ تم کون ہو۔ وہ تمھیں گھر لے جائیں گے۔ پولیس والے بہت سے اچھے کام بھی کرتے ہیں۔ سارے ہی خراب نہیں ہوتے۔"

دواخانے میں ڈاکٹر نے اس کے زخموں کی مرہم پٹّی کی، سر پر برف لگائی، کہنی پر پٹّی باندھی اور پٹّی کو ٹیپ سے چپکا دیا۔ وہ صاحب جو اُسے یہاں تک لائے تھے، ڈاکٹر سے پوچھنے لگے۔

"تھانہ کہاں ہے؟"

"مجھے غسل خانے جانا ہے۔" اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ جواب دیتے، لڑکا بول اُٹھا۔

"اِدھر چلے آؤ" ڈاکٹر نے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

دواخانے کے پیچھے والا دروازہ ایک لمبے برآمدے میں کھلتا تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ چلتا ہوا ادھر آیا۔ غسل خانے میں داخل ہوا۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

وہ غسل خانے کے پچھلے دروازے سے باہر نکلا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

بڑی سڑک اُلٹے ہاتھ کو تھی، سو وہ سیدھے ہاتھ کو چلنے لگا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ پکڑا جائے۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس وقت تو یہی کافی تھا کہ وہ پولیس والوں کے پاس نہیں جا رہا۔ گلی کے لوگ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے، شاید اس لیے کہ وہ لنگڑا رہا تھا۔ اس کے کپڑے میلے تھے اور ان پر خون کے دھبے تھے۔ اس کی کہنی پر پٹی بندھی ہوئی تھی، لیکن کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ چلتا رہا۔ کہیں دُور سے ریل کی سیٹی کی آواز آئی۔

وہ گلی ایک بہت پُرشور، مصروف سڑک پر جا نکلی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ ریل کی پٹری اس کے اُلٹے ہاتھ پر تھی، لوہے کے کٹہرے کے پیچھے۔ بہت ساری پٹریاں ایک دوسرے کے برابر بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف مال گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ریل کی سیٹی اب بہت واضح اور صاف سُنائی دے رہی تھی۔ لوہے کا کھمبا، جس پر دھات کے نشان بنے ہوئے تھے، اس کے عین سامنے تھا، پٹری کے قریب۔ سُرخ اور سبز بتّیاں، گول اور چمک دار اس کھمبے پر لگی ہوئی تھیں۔ کیا کہتے ہیں انھیں؟ اسے یاد نہیں آیا۔

اسٹیشن اس کے سامنے تھا، بڑا سا، ایک ریل آئی۔ پلیٹ فارم لوگوں سے بھر گیا۔

وہ لنگڑاتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ریل اس کے سامنے تھی۔ انجن نے تیز آواز میں سیٹی دی۔ اسے احساس ہوا کہ اُسے اسی ریل پر سوار ہونا ہے۔ یہ اس کے لیے ایک موقع تھا۔ چڑھو۔ جلدی۔ ابھی۔ فوراً۔

اس کے چاروں طرف لوگ جلدی کر رہے تھے، پیچھے سے دھکیلتے ہوئے آگے سے دباتے ہوئے، دائیں اور بائیں ہٹاتے ہوئے۔ کسی کی گٹھڑی اس کی پیٹھ میں لگی اور وہ گرتے گرتے بچا۔ وہ سنبھلا تو اُس نے دیکھا کہ ریل نے چلنا شروع کر دیا ہے۔ ڈبے گزرنے لگے۔ وہ آگے بڑھا۔ سارے دروازے بند تھے۔ اگر دروازے کھلے نہیں ہوں گے تو وہ اندر کیسے جائے گا؟

یہ رہا ایک کھلا تھا۔ پہنچ پائے گا وہ؟ نہیں، پہنچ نہیں پائے گا۔ اس کے بازو اتنے مضبوط نہیں تھے۔ نہ اس کی ٹانگیں، مگر اُسے معلوم تھا کہ یہ موقع اس کے لیے ہے۔ اسے یہ کام کرنا ہی ہوگا۔

اس نے بازو آگے کر دیے اور ریل کی سمت بڑھا۔ اسے اس کے ساتھ ساتھ بھاگنا پڑے گا، اس کا ڈنڈا پکڑ کر کودنا پڑے گا۔ اگر اس کا پیر پھسل گیا تو...

اس کے پیر اب زمین پر نہیں تھے۔ وہ پھسلا نہیں تھا۔ دروازے سے ایک بازو نکل آیا تھا اور اس کو کمر سے پکڑ کر ریل کے اندر گھسیٹ لیا تھا۔ ایک ناراض آواز نے اس کا استقبال کیا۔

"چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو؟ اگر میں تمھاری ان کانپتی ٹانگوں پر لات مار دیتا تو کیا کرتے؟" (باقی آئندہ)

سپاہی: (ڈاکو سے) تمہیں ڈاکہ ڈالتے ہوئے شرم نہیں آتی"۔

ڈاکو: "اسی لئے تو منہ پر نقاب ڈال لیتے ہیں"

شیخ عاصم لطیف ——— گلبرگ لاہور

کنجوس وکیل (بیٹے سے) "میں چاہتا ہوں تم بھی وکیل بنو"

بیٹا: "مگر کیوں ڈیڈی؟"

وکیل: "تاکہ میرا کالا کوٹ تمہارے بھی کام آئے"۔

شاہ رُخ ——— میرپور خاص

اُستاد (شاگرد سے) "بارش کے وقت بجلی کیوں چمکتی ہے؟"

شاگرد: "فرشتہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی کھیت سوکھا تو نہیں رہا"

———

اُستاد (شاگرد سے) "اگر دُنیا میں پانی نہ ہوتا تو کیا ہوتا"؟

شاگرد: "جناب پھر ہمیں دودھ خالص ملتا"۔

وقاص یوسف ——— فیصل آباد

باجی اخبار پڑھتے ہوئے "کانپور میں ایک پاگل کنوئیں میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا"

مُنا: "بے وقوف کنوئیں میں گرا تھا تو پانی سے ہی ہاتھ دھو لیتا"

———

ایک آدمی تالاب پر نہانے گیا۔ سامنے لکھا تھا۔ پیچھے دیکھیں، اُس نے پیچھے کی طرف دیکھا تو لکھا تھا دائیں طرف دیکھیں۔ جب دائیں طرف دیکھا تو لکھا تھا بائیں طرف دیکھیں۔ بائیں طرف دیکھا تو لکھا تھا آپ نہانے آئے ہیں یا اِدھر اُدھر دیکھنے۔

عامر یوسف ——— فیصل آباد

ایک شخص نے قسطوں پر ریڈیو خریدا، مگر کئی ماہ تک قسط ادا نہ کی، کمپنی والوں کی طرف سے اُسے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا "اگر آپ سے ریڈیو واپس لے لیا جائے تو آپ کی بڑی بے عزّتی ہوگی۔ ذرا سوچئے آپ کے ہمسائے آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔

چند دنوں بعد کمپنی والوں کو جواب موصول ہوا۔ "میں نے پڑوسیوں سے پوچھ لیا ہے وہ اطمینان کا سانس لیں گے۔"

حسن مہندی خراسانی ——— انچولی کراچی

مُلّا نصیر الدّین نے ایک ادیب کو گھر بلایا۔ ادیب صاحب مُلّا جی کے گھر پہنچے تو موصوف کہیں گئے ہوئے تھے۔ نازک مزاج ادیب کو بہت غصّہ آیا۔ وہ ملّا کے دروازے پر "احمق" لکھا دیکھ کر سیدھے ادیب کے گھر گئے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی "مجھے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ واپس آیا تو اپنے دروازے پر حضور کا نام لکھا دیکھ کر فوراً حاضر ہوگیا ہوں ———

ایک پریشان حال شخص ایک شخص کے پاس شناختی کارڈ کا فارم پُر کروانے گیا۔

انھوں نے پوچھا "تمھارا نام؟" نائب خان ولد شادی خاں۔" انھوں نے پھر پوچھا کوئی شناختی علامت؟"

بولا لکھ دیجئے "چہرے پر پریشانی کے آثار" ـ

اُستاد (شاگرد سے) "بتاؤ وہ کیا چیز ہے جس سے پیچھا چھڑانے کی کتنی ہی کوشش کی جائے وہ پیچھا نہیں چھوڑتی"۔

شاگرد: "جناب وہ چیز ہوم ورک ہے"۔

صائمہ یونس ——— گرومندر

"ارے بھائی یہ اینٹ کیوں اُٹھائے پھر رہے ہو؟"

"میں اپنا مکان بیچنا چاہتا ہوں یہ اُس کا نمونہ ہے۔"

باپ: بیٹے تم اپنی زندگی میں کبھی اوّل بھی آئے ہو۔

بیٹا: کیوں نہیں، اسکول سے چھٹی ہوتی ہے تو سب سے پہلے میں ہی گیٹ سے باہر آتا ہوں۔

سیّد اسلم شاہ ——— ؟

اُستاد (شاگرد سے) "برف کو جُملے میں استعمال کرو۔"

شاگرد: "جناب پانی بہت ٹھنڈا ہے۔"

اُستاد (غصّے سے) "اِس جُملے میں برف کہاں ہے؟"

شاگرد: "جناب وہ تو پگھل چکی ہے۔"

دلیپ کمار ——— رانوتی سندھ

امیر (مسخرے سے) تمھارا نام کیا ہے؟

مسخرا: جناب، احمق!

امیر: ہنستے ہوئے واہ نام تو خوب ہے، ہمیں پسند آیا۔

مسخرا: حضور، یہ نام آپ کو پسند ہے تو آپ رکھ لیں، میں کوئی اور نام رکھ لوں گا۔ ———

لڑکا: (دکاندار کو برتن دیتے ہوئے) ایک سیر گائے کا دودھ دے دو۔

دکاندار: یہ برتن چھوٹا ہے۔

لڑکا: تو بکری کا دودھ دے دو۔

پرنس وسیم بن اشرف ——— بورا روڈ میاں چنوں

مریض، ڈاکٹر صاحب، کھانسی تو بند ہوگئی ہے لیکن سانس رُک رُک کر آتا ہے۔

ڈاکٹر: اطمینان رکھو، وہ بھی بند ہو جائے گا۔

غلام اصغر زاہد ——— باھووال

ایک آدمی نے سردارجی کا بایاں بازو کٹا ہوا دیکھ کر کٹنے کی وجہ دریافت کی تو سردارجی نے جواب دیا۔

"چند دن پہلے میں لکڑیاں کاٹنے والے آرے پر کام کر رہا تھا کہ اچانک میرا دایاں ہاتھ آرے میں آنے لگا تو میں نے دایاں ہاتھ نکال کر بایاں ہاتھ آرے میں دے دیا تاکہ کام کرنے کے قابل رہ سکوں۔"

سعدیہ ضیاء ——— بھیرپور

امجد اور نصیر کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں امجد کا ایک پڑوسی ملا۔ امجد نے سلام کیا تو اس نے جواب نہیں دیا نصیر نے پوچھا "یہ کون بدتمیز ہے جو سلام کا جواب ہی نہیں دیا۔"

"میرا پڑوسی ہے۔ کبھی کوئی چیز نہیں دیتا۔"

رشید: میری بلی اپنا نام بھی لے سکتی ہے!

ندیم: کمال ہے! کیا نام ہے اس کا؟

رشید: میاؤں!

مہوین فاطمہ گوھر ——— کراچی

ایک شخص نے حیوانات کے ڈاکٹر کو فون کیا!

"میرا گھوڑا کبھی ٹھیک چلتا ہے کبھی لنگڑانے لگتا ہے"

"اس وقت کیا پوزیشن ہے"، ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اس وقت تو ٹھیک چل رہا ہے۔"

"تو اسے فوراً بیچ ڈالو" ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔

"ٹی وی پر سگریٹ نوشی کے خلاف جو خوفناک اشتہار آتا ہے اسے دیکھ کر میں لرز اٹھتا تھا۔"

"تو پھر تم نے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہوگی۔"

"نہیں بلکہ میں نے ٹی وی بیچ دیا۔"

سراج الدین احمد ——— ملیر کراچی

ایک شخص! آپ کا چھوٹا بچہ تو بہت بُری بُری گالیاں دیتا ہے۔

دوسرا شخص: ابھی وہ بچہ ہے، بڑا ہو گا تو اچھی اچھی گالیاں دیا کرے گا۔

محمد اشرف ——— کمالیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ

ایک دیہاتی نے اے سے لے کر زیڈ تک سارے انگریزی حروف یاد کر لئے۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک شہری سے ہوئی تو اس نے شہری سے پوچھا۔

"تم کتنی جماعت تک پڑھے ہوئے ہو"، شہری نے جواب دیا "بی۔ اے تک" یہ سن کر دیہاتی نے مسکرا کر کہا "واہ بابو واہ دو حروف پڑھے وہ بھی اُلٹے۔"

منیر احمد فاضل ——— بڑووڈ روڈ، لاھور

"بابو اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ مولا تمہارا بھلا کرے گا" سارا دن وہ یہ صدا لگاتے ہوئے بھیک مانگتا رہا۔ شام ڈھلے جب وہ گھر واپس پہنچا تو نہا دھو کر وی سی آر پر فلم دیکھتے ہوئے اس نے سوچا "پرسکون زندگی گزارنے کے لئے آدمی کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔"

راحیلہ ——— شاہ فیصل کالونی، کراچی

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وہائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس:

عبداللہ ہارون روڈ فون: ۵۱۱۷۱۱

شاخیں:

○ بہادر آباد	فون: ۴۱۳۶۹۵	○ ڈیفنس فیز V	فون: ۵۲۶۵۳۹
○ جمشید روڈ	〃 ۴۱۱۳۰۲	○ امیر خسرو روڈ	〃 ۴۱۳۶۹۵
○ کھارادر	〃 ۲۲۵۸۰۳	○ راشد منہاس روڈ	〃 ۴۱۱۳۰۲
○ گارڈن روڈ	〃 ۷۲۲۴۳۳	○ حسن اسکوائر	〃 ۵۲۶۵۳۹
○ برنس روڈ	〃 ۲۰۲۳۲۶		

سنو وہائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس: عبداللہ ہارون روڈ، کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس: صدر بازار۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

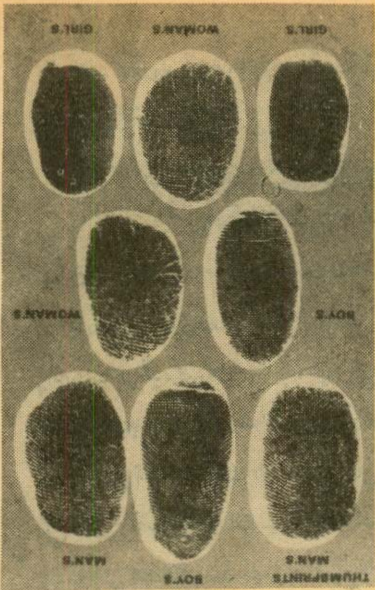

فنگر پرنٹس

جس کے ذریعے مجرم پکڑے جاتے ہیں

نیّر ابدالی

آپ ہر روز اپنے ہاتھوں سے بہت سارے کام کرتے ہوں گے۔ لکھتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے، وضو کرتے ہوئے اور سب سے بڑھ کر دُعا مانگتے ہوئے آپ کی نظر اپنے ہاتھوں پر ضرور پڑتی ہوگی۔ کبھی آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر بنے ہوئے نشانات اور ان کی ساخت پر غور کیا ہے۔ یا آپ نے سوچا کہ انگلیوں پر بنے ہوئے ان نشانات کا کیا مقصد ہے؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ انگلیوں کے یہ نشانات یعنی فنگر پرنٹس کا ایک مقصد "شناخت" کرنا ہے۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ فنگر پرنٹس کا شناخت کرنے کے عمل سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ آئیے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

بظاہر فنگر پرنٹس ایک جیسے نظر آتے ہیں مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ کسی بھی دو افراد کے حتیٰ کہ ان لوگوں کے فنگر پرنٹس بھی ایک جیسے نہیں ہوتے جو جُڑواں پیدا ہوتے ہیں۔ فنگر پرنٹس کی تشکیل اسی وقت ہو جاتی ہے جب انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی موت تک یہ لکیریں اس کے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔

فنگر پرنٹس کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ محراب دار Arch Type اس قسم کے فنگر پرنٹ پوری دنیا میں صرف چھ فیصد کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ چھلّے دار Loops یہ قسم پوری دنیا میں پچیس فیصد کی تعداد میں موجود ہے۔

۳۔ بھنور دار Whorl اس قسم کے فنگر پرنٹس کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ ساٹھ سے پینسٹھ فیصد کی تعداد میں موجود ہیں۔

۴۔ حادثاتی Composites یہ چار فیصد سے لے کر نو فیصد تک پائے جاتے ہیں۔

فنگر پرنٹ کی قسمیں اور تعداد معلوم ہو جانے کے بعد مختلف قسم کے جرائم کی تفتیش میں بڑی مدد ملی ہے۔ اس لیے کہ جرائم کی تفتیش کے دوران سب سے پہلا مرحلہ فنگر پرنٹس کے نمونے حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یعنی جرم کے دوران مجرم کے ہاتھ کے نشانات کی مدد سے اس کی "شناخت" آسانی سے ہو جاتی ہے۔ فنگر پرنٹ کا نمونہ سب سے پہلے محکمۂ پولیس کے اس شعبے میں بھیجا جاتا ہے۔ جہاں مجرموں کی انگلیوں کے نشانات کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ وہاں معلوم ہو جاتا ہے کہ جائے واردات سے انگلیوں کے جو نمونے حاصل کیے گئے ہیں وہ کس مجرم کے ہیں۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد قانون نافذ کرنے والے ادارے یعنی پولیس اور انٹیلیجنس کے افراد بہت جلد مجرم کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جائے واردات سے حاصل کیے گئے نشانات پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود نہیں ہوتے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ نمونے دوسرے شہروں کی پولیس کو بھیجے جاتے ہیں۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہاں اس قسم کا کوئی نمونہ موجود ہے یا نہیں۔ اس سے یہ معلوم کرنے میں آسانی رہتی ہے کہ مجرم کس شہر کا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص پہلی مرتبہ کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی انگلیوں کے نشانات حاصل کر کے فنگر پرنٹ سیکشن میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ فنگر پرنٹ سیکشن میں صرف انگلیوں کے نشانات ہی نہیں موجود ہوتے بلکہ مجرم کے جرائم کا مکمل ریکارڈ بھی ہوتا ہے جس سے یہ معلوم کرنے میں آسانی رہتی ہے کہ مجرم اب تک کتنے جرائم کا ارتکاب کر چکا ہے۔

آج سے ہزاروں سال پہلے چینیوں نے بھی مختلف مقاصد کے لیے فنگر پرنٹ کا استعمال کیا تھا لیکن سب سے پہلے جس شخص نے مجرموں کی شناخت کے لیے فنگر پرنٹ استعمال کیا وہ برطانیہ کے ڈاکٹر ہنری فالڈز تھے۔ یہ ۱۸۸۰ء کا ذکر ہے۔ اس کے بارہ سال بعد ایک اور نامور برطانوی سائنسدان سر فرانسس گیلٹن نے ثابت کیا کہ دو اشخاص کے فنگر پرنٹ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پہلی مرتبہ فنگر پرنٹ کا مکمل ریکارڈ جمع کیا۔

امریکہ میں ۱۹۲۴ء میں فیڈرل بیورو آف انویسٹیگیشن F. B. I میں ایک "محکمۂ شناخت" قائم کیا گیا۔ اُس وقت وہاں آٹھ لاکھ دس ہزار ایک سو اٹھارہ افراد کے فنگر پرنٹ کے نمونے موجود تھے۔

آج کل ایف بی آئی میں موجود فنگر پرنٹ کے نمونوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زائد ہے۔ ان میں چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور بین الاقوامی سطح کے مجرموں کے فنگر پرنٹ ہیں۔

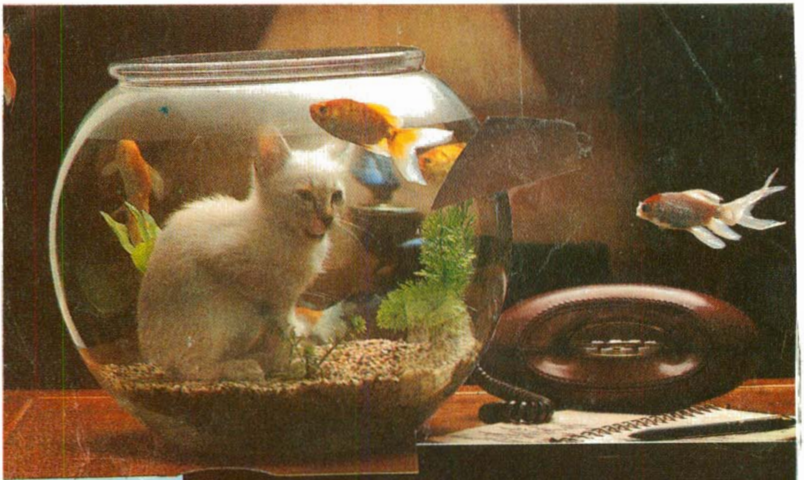

آپ نے یقیناً ایسی کہانیاں پڑھی ہوں
گی جن میں کوئی جن خوبصورت شہزادی
کو پکڑ کر بوتل میں بند کر دیتا ہے۔ کہا جاتا
ہے کہ سائنس جدید دور کا ایسا جن ہے جس
کے نظر نہ آنے والے ہاتھوں سے دنیا کا ہر
کام ممکن ہے۔

ذرا غور سے ان تصاویر کو دیکھیے
جدید دور کے اس جن نے بلّی کو پانی
سے بھرے جار میں ننھّی مُنّی رنگ برنگی
مچھلیوں کے ساتھ بند کر دیا ہے اور
ایک پیاری سی بچّی کو پرانے طرز کی گھڑی
میں قید کر دیا ہے ۔ "جدید جن"
نے یہ کارنامہ کیمرہ ٹرک کے
ذریعے انجام دیا ہے۔

"ہے نا حیرت کی بات؟"

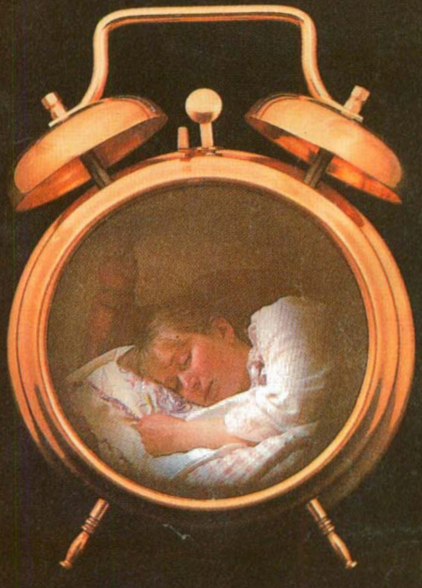

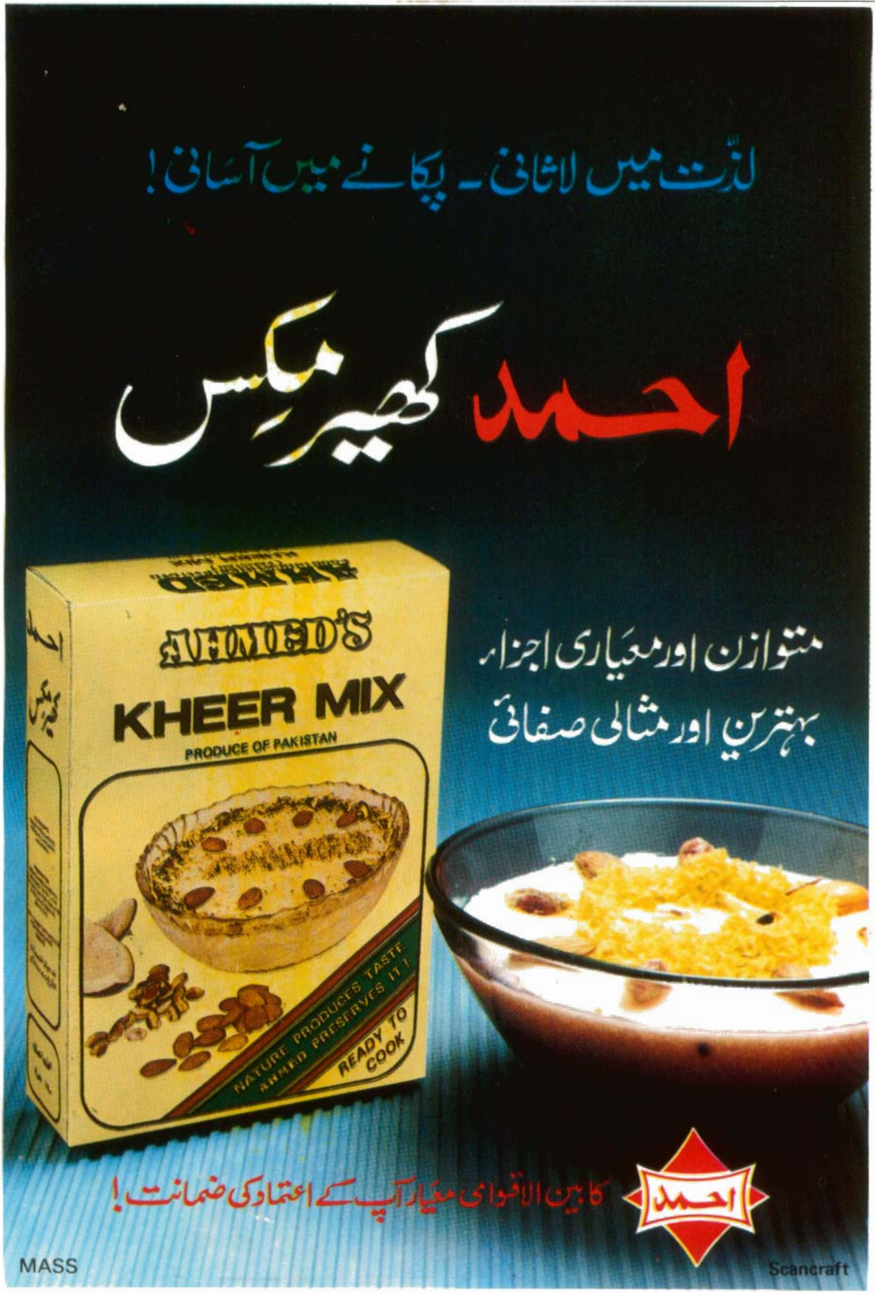
لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی !
احمد کھیر مکس
AHMED'S
KHEER MIX
PRODUCE OF PAKISTAN
NATURE PRODUCES TASTE AHMED PRESERVES IT !
READY TO COOK
متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی
احمد
کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت !
MASS
Scancraft

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

احمد حاطب صدیقی

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

میں کیسے میٹھی بات کروں — جب میٹھی "چیجی" کھائی نہیں
آپی بھی پکاتی ہیں حلوہ — وہ ___ آخر کیوں حلوائی نہیں
بھیّا کی جو منگنی ہو گئی کل — کیوں کل ہی دلہن منگوائی نہیں

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

کیوں لمبے بال ہیں بھالو کے — کیوں اُس کی "ٹنڈ" کرائی نہیں
کیا وہ بھی "گندا بچہ" ہے — یا اُس کے ابّو ___ بھائی نہیں
یہ اُس کا ہیئر اسٹائل ہے — یا جنگل میں کوئی نائی نہیں

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

جو تارے جھلمل کرتے ہیں — کیا اُن کی چچی ___ تائی نہیں
ہوگا کوئی رشتہ سورج سے — یہ بات ہمیں بتلائی نہیں
یہ چندا کیسا ماما ہے — جب امّی کا وہ بھائی نہیں

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

اِک نیا کمال
اِک نیا معیار
نئے دور کی نئی پینسل
Goldfish
DELUXE PENCIL
شاہ سنز لمیٹڈ
ڈی ۸۸-ایس آئی ٹی ای-کراچی
فون: ۲۹۳۴۵۱، ۲۹۳۴۵۲

Midas Khi

رضیہ فصیح احمد

ڈرامہ

بدلہ

کردار

سب لڑکوں کی عمر بارہ سے پندرہ سال ہے ۔

۱۔ منصُور :۔ بے حد سُست ۔ دوسروں پر کام ڈالنے میں ماہر ۔

۲۔ زاہد :۔ ذرا موٹا سا ہے اسی لیے خطاب ملا ہے "کدّو" ۔

۳۔ جاوید : دُبلا پتلا قدرے ڈرپوک ۔

۴۔ شاہد : کھانے پینے کا بے حد شوقین ۔

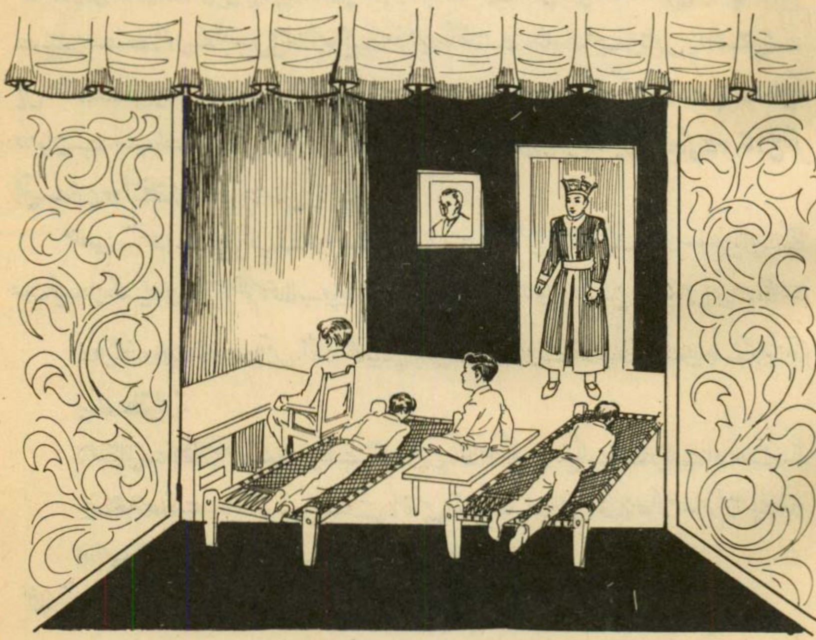

۵۔ امجد:- ان سب کے ٹولے میں شریک ہے مگر شرارتوں میں نہیں۔ انھیں باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

۶۔ اعظم:- ٹولے سے الگ، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ڈرامے میں جو پارٹ کرنا ہوتا ہے سطریں یاد کرتے وقت بھی وہی لباس پہننے کی کوشش کرتا ہے۔

۷۔ ہاسٹل کے وارڈن تیس پینتیس سال کے درمیان۔ بااصول مگر نرم مزاج۔ بچوّں کی اصلاح کی خاطر ان کی شرارتیں بھی برداشت کرتے ہیں۔

مقام:- گورنمنٹ اسکول کا ہاسٹل۔ ہر کمرے میں دو لڑکے رہتے ہیں لیکن راتوں کو شرارتیں کرنے ایک دوسرے کے کمرے میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

پہلا ایکٹ

لڑکوں کے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس کا ایک کمرہ جس میں دو دروازے ہیں پچھلی دیوار کا دروازہ غسلخانے میں کھلتا ہے۔ بائیں طرف کی دیوار کا دروازہ باہر کھلتا ہے۔ کمرے میں دو چارپائیوں پر بستر بچھے ہوئے ہیں۔ دونوں چارپائیوں کے درمیان ایک تپائی ہے جس پر میز پوش پڑا ہوا ہے اور چند کتابیں رکھی ہیں۔ دائیں طرف لکھنے کی ایک میز اور اس کے دو طرف کرسیاں ہیں۔ دیواریں کھونٹی پر کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں اور ایک گتّے کا بنا ہوا پرانی قسم کا کیلنڈر جس میں اوپر مہینے اور نیچے خوب بڑے حروف میں تاریخ لکھی دور سے نظر آتی ہے۔ پردہ اُٹھنے سے پہلے بہت سے لڑکوں کے قہقہوں کی آواز اُبھرتی ہے، فوراً پردہ اُٹھتا ہے۔ شاہد اور امجد بستروں پر اوندھے پڑے ہیں۔ منصور لکھنے کی میز پر چڑھا بیٹھا ہے اور زاہد پلنگوں کے درمیان تپائی پر۔ سب لڑکوں کی عمر بارہ سے پندرہ سال کے درمیان ہے۔ سب رات کے لباس میں ملبوس ہیں جو مختلف وضع قطع کے ہیں۔ کیلنڈر میں اگست کی ۲۵ ر تاریخ نظر آتی ہے) پردہ اُٹھتے ہی منصور کہتا سنائی دیتا ہے۔

منصور:- "حضرات! آج کی گپ کے عنوان سے جو انعامی مقابلہ ہوا اس میں زاہد عرف کدّو سب پر بازی لے گئے صرف ایک دن کے لیے ان کو گپیّ اعظم کا خطاب دیا جاتا ہے (زاہد کے سوا سب تالیاں بجاتے ہیں) اب میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا انعام لے جائیں۔ آئندہ مقابلے پر جو کل منعقد ہوگا ان سے خطاب واپس لے لیا جائے گا البتّہ انعام یہ رکھ سکتے ہیں۔"

(زاہد تپائی سے اُٹھ کر منصور کے پاس جاتا ہے۔ منصور میز پر رکھا ہوا ایک بڑا سا پیکٹ اسے دیتا ہے اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ زاہد جس نے پیکٹ دائیں ہاتھ میں تھام رکھا ہے بایاں ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرتا ہے۔ شاہد اور امجد اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سب زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں)

شاہد۔ "میں کدّو، سوری، گپیّ اعظم سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا انعام ہمیں بھی دکھائیں۔"

زاہد۔ "ضرور، ضرور!(جلدی سے اخبار کا کاغذ کھول کر پھینکتا ہے سب غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک بڑا سا ڈبہ ہے جیسے مٹھائیوں کے ڈبے ہوتے ہیں۔ ڈھکن کھول کر ایک چُسنی نکال کر دکھاتا ہے جو بچوں کو بہلانے کے لیے ان کے منھ میں دے دی جاتی ہے اور اکثر بچوں کے گلے میں پڑی نظر آتی ہے۔ سب ہنستے ہیں)

منصور۔ "یہ اس لیے ہے کہ بی اعظم کچھ دیر اس سے شوق فرما کر اپنی چوں چوں بند رکھیں"۔(چُسنی اس کے ہاتھ سے لے کر گلے میں ڈال دیتا ہے۔ سب پھر تالیاں بجاتے ہیں)

(باہر کے دروازے سے اعظم غصّے میں بَل کھاتا ہُوا داخل ہوتا ہے۔ اس نے دھاری دار نائٹ سوٹ پہن رکھا ہے اور سَر پر گتّے اور چمکدار پنّی کا بنا ہوا بڑا سا تاج ہے جیسے ڈراموں وغیرہ میں اکثر بادشاہوں کو پہنائے جاتے ہیں)

اعظم۔ (بگڑ کر)"یہ کیا شور مچا رکھّا ہے تم لوگوں نے؟"

منصور۔(شرارت سے)"با ادب با ملاحظہ ہوشیار! شہنشاہِ عالی تبار تشریف لاتے ہیں"۔

(سب جلدی جلدی اپنی جگہوں سے اُتر کر ہاتھ باندھ کر، گردن جُھکا کر ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں)

زاہد۔ (جُھک کر)"کیا حُکم ہے عالی جاہ"؟

اعظم۔ (ابھی تک ناراض ہے)"میں بک رہا ہوں کہ مجھے ڈرامے کے لیے اپنا پارٹ یاد کرنا ہے اور تم لوگوں نے شور مچا کر آسمان سر پہ اُٹھا رکھّا ہے"۔

شاہد۔ (جُھک کر)"گستاخی ہوئی عالی جاہ، آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ ہاں یاد رکھو اگر آئندہ ایسا ہوا تو بادشاہ سلامت تم سب کے بیوی بچّوں کو کولھو میں پلوا دیں گے"۔(سب قہقہہ لگاتے ہیں)

اعظم۔ "نہیں مانو گے تم لوگ، میں ابھی وارڈن صاحب سے کہتا ہوں" (باہر کی طرف جانے لگتا ہے۔ منصور لپک کر اُسے پکڑ لیتا ہے)

منصور۔ "گستاخی ہوئی اعظم بھائی، معاف کر دو۔ اب اگر چُوں بھی کریں تو جو چور کی سزا وہ ہماری"۔

اعظم۔ (موڈ میں آ کر)"یار مذاق نہیں۔ صبح مجھے پارٹ یاد نہیں تھا تو ماسٹر صاحب بہت بگڑے کہہ رہے تھے کہ اگر کل بھی یاد نہیں ہوا تو وہ شوکت کو بادشاہ بنا دیں گے اور مجھے بہشتی"۔

شاہد۔ "بادشاہ سے بہشتی! ایک دم اتنی ترقّی!!"

زاہد۔ "ایک دم سے اتنی ترقّی مل گئی تو تمھارا دماغ اور خراب ہو جائے گا، پہلے ہی اللہ کے فضل سے کافی ہے"۔

منصور۔ (اعظم کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے)"بُرا نہ ماننا اعظم بھائی، ویسے میرا خیال ہے کہ تم بہشتی کے پارٹ کے لیے عین مین موزوں ہو"۔

شاہد - "اس میں کوئی شک نہیں، میں خود تمھیں یہی رائے دینے والا تھا۔"

اعظم - (پھر بُرا مان کر) "دیکھو تم نہیں مانو گے، میں جاتا ہوں" (دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔)

زاہد - (راہ روک کر اور شرارت سے ہاتھ باندھ کر) "جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو کچھ پوچھوں"؟

اعظم - (اکھڑ لہجے میں) "کیا ہے"؟

زاہد - "اس ناچیز بندے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی (اعظم کے سر سے پیر تک اشارہ کرتا ہے) یہ لباسِ شب خوابی اور یہ تاج"؟

منصور - "اتنی بات سمجھ لیتے تو بادشاہ نہ ہوتے"!

اعظم - "میں ہمیشہ پورا کاسٹیوم بدل کر آئینے کے سامنے اپنا پارٹ یاد کرتا ہوں۔ آئینہ چھوٹا ہے۔ اس میں صرف چہرہ نظر آتا ہے اس لیے میں نے سارے کپڑے پہننے کے بجائے صرف تاج پہننا کافی سمجھا"۔

منصور - "ویل ڈن! دیکھا اس کو کہتے ہیں سمجھ داری کی بات اور یہ صرف بادشاہوں کے دماغ میں آسکتی ہے"۔

شاہد - (جلدی سے) "یا پھر بہشتیوں کے"۔

(سب قہقہہ لگاتے ہیں۔ اعظم غصّے میں پیر پٹختا باہر جانے لگتا ہے۔ دروازے میں اندر آتے ہوئے جاوید سے ٹکرا جاتا ہے۔ تاج زمین پر گر پڑتا ہے)

جاوید - "ویری سوری یور ایکسی لینسی" (تاج اٹھا کر اعظم کو دینے کے بجائے اپنے سر پر رکھ لیتا ہے۔)

اعظم - "میرا تاج دو، مجھے ڈرامے کے لیے پارٹ یاد کرنا ہے"۔

جاوید - "ابھی اس کمرے میں ایک بڑا اچھا ڈرامہ ہوگا۔ بادشاہ سلامت چاہیں تو اس میں بھی حصّہ لے سکتے ہیں"۔

اعظم - "میں تمھاری کسی شرارت میں حصّہ نہیں لوں گا" (تاج اُتار کر اپنے سر پر رکھ لیتا ہے)

جاوید - "مت لو، مگر ایک ایک سیر کا ایک آم ہے یہ بتائے دیتا ہوں"۔

منصور - "یار جانے دو بادشاہ سلامت کو، یہ بتاؤ ننھّو جی سو گئے"؟ (اعظم چلا جاتا ہے)

جاوید - "سُلا دیا۔ میں نے کہا میاں یہاں تو ساڑھے آٹھ بجے سب کو زبردستی سونا پڑتا ہے۔ اگر ایک منٹ دیر تک بتّی جلتی رہے تو وہ پٹائی ہوتی ہے وہ پٹائی ہوتی ہے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ بس بے چارہ سہم گیا۔ سوا آٹھ بجے میں خود بھی کپڑے بدل کر لیٹ گیا اور اس کو بھی لٹا دیا۔ اب حضرت خرّاٹے لے رہے ہیں"۔

(خوں خوں، - خرّاٹوں کی نقل اُتارتا ہے)

شاہد - "تو پھر خالی ہاتھ کیوں چلے آئے مال وال لے کر آتے۔ بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے"۔

جاوید۔ "ارے دو من آموں کا ٹوکرا مجھ اکیلے سے اٹھتا ہے۔ تم بھی کچھ ہاتھ پیر ہلاؤ۔"

منصور۔ (بستر پر لیٹے ہوئے) "ہاں یارو جاؤ، ذرا ٹوکرا پکڑوا لاؤ نا۔ اس بے چارے مِڈّے سے کیسے اُٹھے گا اتنا بڑا ٹوکرا۔ ارے جاؤ نا کدّو اتنا بڑا ڈیل ڈول کس دن کام آئے گا۔"

شاہد۔ "اچھا چلو چلتے ہیں مگر یاد رکھو جو کام نہیں کرے گا اُسے کچھ ملے گا بھی نہیں۔"

منصور۔ "جاؤ، میں ذرا دروازے پر نظر رکھوں گا کبھی بادشاہ سلامت پھر نہ ٹپک پڑیں۔"

(جاوید، زاہد اور شاہد جاتے ہیں)

امجد۔ "منصور، یہ کیا قصّہ ہے ٹوکرے کا؟"

منصور۔ "معلوم نہیں تم کون سی دنیا میں رہتے ہو یار جاوید کے کمرے میں آج ایک نیا اُلّو پھنسا ہے، بہت موٹا مرغا ہے۔ ٹوکرے آموں کے، ناشتے دان اور ڈبّے پہ ڈبّے مٹھائیوں کے، وہی اُڑانے جا رہے ہیں یہ لوگ۔"

امجد۔ "جبھی آج تم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا۔"

منصور۔ "اور کیا تمھاری طرح بدّھو ہیں کہ بھوک خراب کر لیتے، پھر اتنی چیزیں بغیر ڈکار لیے کیسے ہضم کرتے۔"

زاہد اور شاہد ایک بڑا سا ٹوکرا بمشکل اٹھائے آتے ہیں اور زمین پر پٹک دیتے ہیں۔ اس کا منھ ٹاٹ سے سلا ہوا

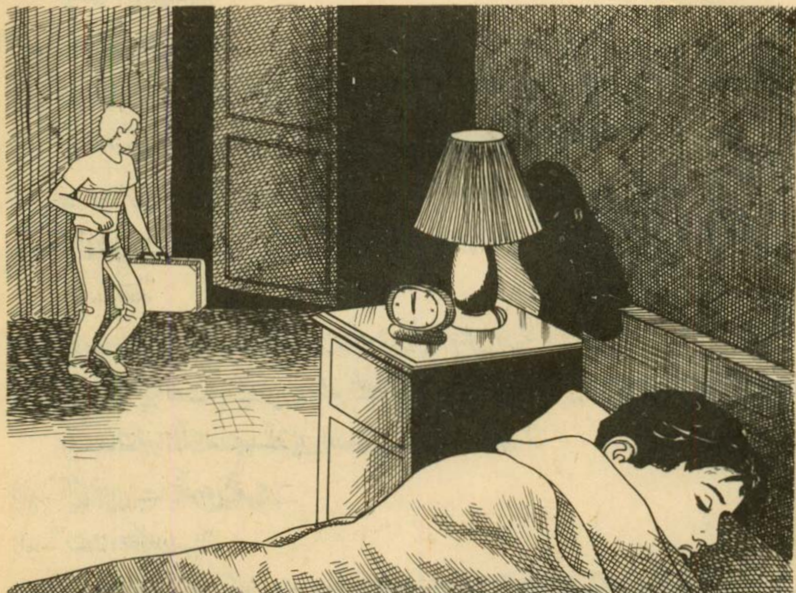

ہے۔ صرف ایک طرف سے ذرا سا کھلا ہوا ہے۔ پیچھے جاوید ایک بڑا سا ٹافی کا بند ڈبہ اٹھائے آتا ہے۔)

شاہد۔ مار دیا بھئی اس خالی پیٹ ورزش نے تو، ایک ہاتھی کا وزن ہے اس ٹوکرے میں۔"

جاوید۔ "ارے آم بھی تو ایک ایک سیر کا ہے۔ مجھے ان حاتم طائی کے بیٹے نے ایک آم مشکل سے نکال کر دیا تھا۔ مگر بھئی کیا مزا تھا، جیسے جیسے ..."۔

منصور۔ (بستر سے چھلانگ لگا کر) "ارے تہہ کر کے رکھو اپنی شاعری، ہم خود دیکھ لیتے ہیں کیسا مزا ہے"۔

شاہد۔ (منصور کو روک کر) "آپ ذرا آرام فرمایئے، پہلے ہمارا حق ہے"۔

(اعظم آتا ہے)

اعظم۔ "میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ ایک دم کمرے میں اتنی خاموشی کیسے ہو گئی"۔

زاہد۔ "تمھیں کسی طرح چین بھی ہے، شور ہو تب بھی پریشان، خاموشی ہو جب بھی حیران"۔

جاوید۔ (ٹافی کا ڈبہ چارپائی پر ڈال کر) "ارے بھئی آؤ نا دیر کس بات کی ہے۔ اٹھو نا۔ امجد"۔

(سب لپکتے ہیں اور ایک ساتھ ٹوکرے میں ہاتھ ڈال کر ہوا میں لہراتے ہیں۔ سب کے ہاتھ میں آم کے سائز کا ایک ایک، پتھر ہے)

منصور۔ "ہت تیرے کی، یہ کیا؟"؟

اعظم۔ "اس کو کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ میں تو جاتا ہوں، کہیں کل کو میرا نام بھی شرارت میں نہ آجائے" (چلا جاتا ہے)

شاہد۔ "ہائے اب کیا ہوگا۔ میرے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہیں بھوک کے مارے"۔

زاہد۔ "یہ سب اس ہنڈے (جاوید کی طرف اشارہ کرتا ہے) کی شرارت ہے۔ کیوں کہاں ہے وہ ایک ایک سیر کا آم"؟

جاوید۔ "مذاق نہیں، میں خود حیران ہوں۔ اس ٹوکرے میں سے نکال کر اس نے مجھے آم دیا۔ خود بھی نکال نکال کر کھا رہا تھا"۔

منصور۔ (دوبارہ بستر پر لیٹتے ہوئے) "اچھی طرح دیکھو شاید کچھ آم بھی ہوں"۔

زاہد۔ "قینچی لاؤ، کپڑا کاٹ کر دیکھتے ہیں (شاہد لکھنے کی میز پر سے قینچی اٹھا کر دیتا ہے۔ زاہد کپڑا کاٹتا ہے۔ سب ایک ساتھ سر اڑا کر اندر جھانکتے ہیں اور مایوسی سے سر ہلاتے ہیں۔)

شاہد۔ "کچھ نہیں ہے، پتھر ہی پتھر ہیں"۔

زاہد۔ "صاف دھوکا دیا ہے"۔

منصور۔ "ارے بھئی ہمیں تو الو کی دم فاختہ بنا دیا ہے اس نئے لڑکے نے، آج تک ہم نے سب نئے لڑکوں کو بیوقوف

بنایا تھا"۔

جاوید۔ (سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔) "یہ تو کچھ جادو کا کھیل ہے، سمجھ میں نہیں آتا میرے سامنے اس نے آم نکالے"۔

شاہد۔ "لاؤ بھئی ٹافی ہی دو، کچھ تو پیٹ میں پڑے"۔

(زاہد چارپائی پر پڑا ہوا ڈبہ کھولتا ہے۔ ہاتھ ڈال کر مٹھی میں کچھ نکالتا ہے اور ہوا میں اُچھال کر واپس ڈبے میں ڈال دیتا ہے۔ ڈبے میں چھوٹے چھوٹے کنکر بھرے ہوئے ہیں۔)

منصور۔ "حد ہوگئی۔ بھئی اس ایک لڑکے نے کتنوں کو بے وقوف بنایا"۔

شاہد۔ "تمھیں بے وقوف بنانے کی فکر ہے یہاں بھوک سے جان نکل رہی ہے"۔

امجد۔ "وہ سُنا ہے تم لوگوں نے لالچ کا انجام بُرا ہے"۔

منصور۔ "یار کیوں جلتی پر تیل چھڑک رہے ہو۔ تہہ کر کے رکھو اپنی نصیحت کا پُلندہ"۔

جاوید۔ "میں تو بھئی اُس کمرے میں رہوں گا نہیں، لڑکا نہیں کوئی جن وِن ہے۔ مجھے خود اس نے اسی ڈبے میں سے نکال کر ٹافیاں دی تھیں۔ دیکھو ایک کاغذ تو اب تک میری جیب میں پڑا ہے"۔ (ٹافی کا رنگین کاغذ نکال کر دکھاتا ہے۔ سب باری باری اُسے چھُو کر اطمینان کرتے ہیں کہ واقعی کاغذ ہے نظر کا دھوکا نہیں ہے۔)

زاہد۔ "جن ہو یا بھوت، مگر اُس نے ہم سب کو چلایا خوب۔ کل کو یہ بات سارے میں پھیل جائے گی۔ یہ کم بخت بادشاہ سلامت کا بچّہ سب کو بتا دے گا اور ہمارا خوب مذاق اُڑے گا"۔

شاہد۔ "بدلہ لیا جائے اس لڑکے سے"۔

زاہد۔ "ہاں بدلہ!"

منصور۔ (جوش میں مُٹھی گھُما کر) "بدلہ!"

امجد۔ "دیکھو ایسی ویسی کوئی بات نہ کرنا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب تک شکایت جائے"۔

شاہد۔ "چُپ رہو جی تم، اگر صبح کے بھُوکے ہوتے تو معلوم ہوتا آٹے دال کا بھاؤ"۔

منصور۔ "پیٹ بھرا ہوا ہے اسی لیے نصیحتیں سُوجھ رہی ہیں"۔

(دُور ایک گھنٹی بجتی ہے)

امجد۔ "سونے کا وقت ہو گیا ہے"۔ (کوئی اس کی بات پر دھیان نہیں دیتا)

زاہد۔ "چلو کیوں نہ ابھی اس کا پلنگ اُٹھا کر تالاب میں پھینک دیں"۔

شاہد۔ "تم پھینک دو، مجھ سے تو سوئی بھی نہیں اُٹھے گی اس وقت، ہاتھ تک کانپ رہے ہیں کمزوری کے مارے"۔

منصور۔ "چلو اِس کے مُنھ پر سیاہی لگا کر آتے ہیں"۔
شاہد۔ "اتنے آدمیوں کا جانا ٹھیک نہیں، یہ کام تو جاوید آسانی سے کر سکتا ہے، اُسی کے کمرے میں جو رہتا ہے"۔
جاوید۔ (گھبرا کر) "میں! نہیں بھئی وہ تو کوئی جن ہے۔ میں تو اس کمرے میں جاؤں گا نہیں، تم میں سے جو رُستم بنتا ہو وہاں جاکر سو جائے"۔
امجد۔ "اب یہ کانفرنس صبح کو کرنا۔ وارڈن آگئے تو پٹائی ہوگی، میں تو جاتا ہوں"۔ (باہر نکل جاتا ہے)
زاہد۔ "جب تک بدلہ لینے کی کوئی ترکیب نہ ہو بندے کو تو نیند آئے گی نہیں"۔

منصور۔ "نہ مابدولت کو"۔
شاہد۔ "نہ مجھے، بھوکے پیٹ بھی کبھی کسی کو نیند آئی ہے"۔
زاہد۔ "اس پیٹو کو سوائے کھانے کی بات کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ارے جلدی کوئی بدلہ لینے کی ترکیب سوچو۔ روشنی دیکھ کر سر آگئے تو مصیبت ہوگی"۔
جاوید۔ "ایک ترکیب کرتے ہیں" (ٹیبل لیمپ جلا کر زمین پر کونے میں رکھتا ہے۔ تپائی سے میز پوش اُتار کر لیمپ کے اوپر ڈال دیتا ہے اور کمرے کی بتی بند کر دیتا ہے۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہے جو باہر سے یقیناً نظر نہیں آئے گی یعنی وارڈن کو)
منصور۔ "شاباش۔ ترکیب سوچنے میں اس کا دماغ خوب چلتا ہے"۔
زاہد۔ "بدلہ لینے کی ترکیب سوچو تو جانیں"۔
جاوید۔ "بھئی بدلہ تو آدمی سے لے سکتے ہیں مگر جن سے ۔۔۔"
منصور۔ "احمق مت بنو۔ اس نے آپ کو گدھا بنا دیا اور آپ ہیں کہ اُسے آسیب اور جن بنا رہے ہیں"۔
شاہد۔ "کیوں نہ بھوت بن کر اُسے ڈرایا جائے"۔
منصور۔ "یہ ٹھیک ہے۔ ڈر کے مارے بچو جی کی گھگی نہ بندھ گئی تو کہنا"۔
شاہد۔ "اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ پہچان کر کسی کا نام نہ بتا سکے گا"۔
زاہد۔ "بس جاوید کو بھوت بناتے ہیں۔ وہ ڈر کر شور مچائے اور سر آئیں تو ہم ان کو باتوں میں لگا لیں گے تم جھٹ سے اپنا حُلیہ بدل کر بستر پر لیٹ جانا۔ قیامت تک انھیں پتہ نہیں چلے گا، یہی سمجھیں گے کہ بچو جی خواب میں ڈر گئے"۔
شاہد۔ "ہم سب یہی ظاہر کریں گے جیسے اس کے چیخنے کی آواز سے ہی اُٹھے ہیں۔ اور صبح اس کا خوب مذاق اُڑائیں گے"۔
منصور۔ "صبح اس سے پوچھیں گے (منھ بنا کر) کیوں بیٹے، گھر میں امّی کے پاس سوتے تھے یا ڈیڈی کے پاس"۔

(سب منھ پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہیں کہ شور نہ ہو۔)

زاہد۔ "اور میں اپنی انعام میں ملی چُسنی اس کو تحفے میں دے دوں گا کہ جب دُودھ کی بوتل یاد آیا کرے اس سے دِل بہلا لیا کرو۔" (اس سب گفتگو کے دوران جاوید سہما ہوا ایک طرف کھڑا رہتا ہے)

منصور۔ "آؤ جاوید، جلدی کرو۔"

جاوید۔ "میں! نہیں بابا، معاف کرو"۔ (ہاتھ جوڑتا ہے)

زاہد۔ "بس اتنا ہی دَم ہے تم میں"۔

جاوید۔ (اکڑ کر) "دَم کی کیا بات کرتے ہو۔ آؤ کشتی کر لو۔ (آستین چڑھا کر سامنے آتا ہے) ابھی چاروں خانے چِت کرتا ہوں، مگر بھئی وہ جن ہے، منٹوں میں مجھے چُرمُر کر دے گا۔"

منصور۔ "دیکھو، یا تو بھُوت بننا منظور کرو، ورنہ برادری سے الگ ہو جاؤ"۔

زاہد۔ "یہ بات پہلے سے طے تھی کہ ہمیشہ مل کر کام کریں گے"۔

شاہد۔ "سوچ لو میں اگر اس کمرے میں رہ رہا ہوتا تو ٹھیک کر دیتا بچُوجی کو۔"

منصور۔ "بولو، جواب دو"۔

جاوید۔ (ڈرتے ڈرتے) "جیسی تمھاری مرضی"۔

زاہد۔ (پیٹھ ٹھونک کر) "شاباش! یہ ہے بہادری"۔

جاوید۔ (پیٹھ سہلا کر) "مار ڈالا یار۔ یہ ذرا کھُرپے ایسے ہاتھ مجھ سے دُور ہی رکھا کرو"۔

منصور۔ اور شاہد} "جاوید! زندہ باد"!!! (باقی آئندہ)

مختصر ترین بندر

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بندر بھارت میں پائے جاتے ہیں، لیکن جنوبی امریکہ میں ایک ایسی نسل کا بندر پایا جاتا ہے، جس کے سر اور جسم کی مجموعی لمبائی قریباً ساڑھے پانچ انچ ہوتی ہے۔ اس نسل کے بالغ بندروں کا وزن عام طور پر قریباً ایک پاؤ ہوتا ہے۔ یہ "منی بندر" درختوں پر رہتے ہیں اور کیڑے مکوڑے یا درختوں کے پھَل کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ اپنی جسامت کے لحاظ سے یہ بندر ایک کیلے پر باآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ بندر دنیا کا سب سے چھوٹا بندر مانا جاتا ہے اور شمالی پیرو، ایکوے ڈور اور مغربی برازیل میں پایا جاتا ہے۔

ملک کی ترقی میں پٹرولیم کی
فراہمی بہت اہمیت رکھتی ہے۔
اس سلسلے میں قابلِ اعتماد خدمات،
معیاری مصنوعات اور فنی اہلیت پی ایس او
کی اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد ہیں۔

PSO پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ

PID (Islamabad) Paragon ● 81 PSO-4

انکل آئی کیو روبوٹ

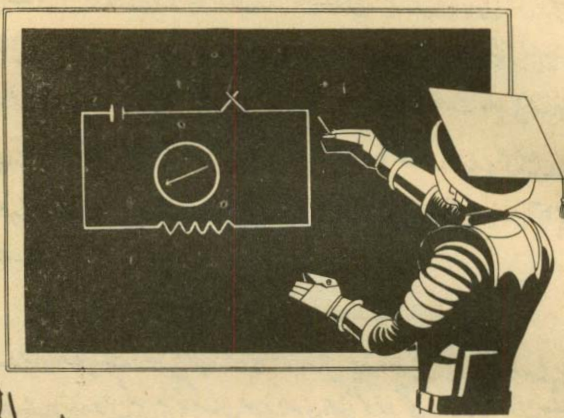

سوالاً جواباً

سورج سے ہر وقت حرارت اور روشنی کیوں اور کیسے خارج ہوتی رہتی ہے؟

خواجہ مطیع الرحمٰن، صدر بازار خانپور

سورج اتنی بڑی مقدار میں حرارت اور روشنی اس لیے خارج کرتا ہے کہ ہماری زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ اگر زیادہ دیر تک سورج نہ نکلے تو ہم سب منجمد ہو کر رہ جائیں۔ سورج کی حرارت ہی ہواؤں میں حرکت پیدا کرتی ہے جو بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہے اور وہ مینہ برساتے ہیں۔ ہمارے اردگرد ہواؤں میں بے شمار جراثیم موجود ہیں۔ سورج کی تیز شعاعیں انھیں ہلاک کر کے ہماری حفاظت کرتی ہیں۔ ہمارے کھانے پینے کے لیے خوراک فراہم کرنے والی تمام فصلیں سورج کی روشنی اور حرارت کی برکت سے ہی تیار ہوتی ہیں۔ سورج نہ نکلے تو کوئی فصل تیار ہی نہیں ہو سکتی۔

آپ کے سوال کے دوسرے حصّے کا جواب یہ ہے کہ سورج دراصل انتہائی گرم گیس کا بہت بڑا گولا ہے اس کی حدّت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے جسم کا درجۂ حرارت صرف ۳۷ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ کھولتے ہوئے پانی کا ۱۰۰ ڈگری، گرم سُرخ لوہے یا چولھے کے شعلے کا ۵۰۰ سے ہزار ڈگری تک ہوتا ہے۔ ۱۵۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ پر لوہا بھی پگھل کر پانی کی طرح بہنے لگتا ہے اور ۳۰۰۰ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ لوہا بھی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے لیکن سورج کا کم از کم درجۂ حرارت ۶۰۰۰ ڈگری ہوتا ہے اور یہ تو سورج کی سطح کا درجۂ حرارت ہے مرکز میں تو اس کا درجۂ حرارت ۲ کروڑ ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج پر کوئی چیز ٹھوس یا مائع حالت میں نہیں رہ سکتی۔

سورج کو ۲۸۰ کھرب کھرب واٹ کا بلب کہا جا سکتا ہے۔ (یعنی ۳۸ کے بعد ۲۵ صفر لگا دیے جائیں) یہ دنیا کو کئی کھرب کلو

واٹ توانائی فراہم کرتا ہے۔ آج کل ایٹم بم اور ہائیڈروجن کا بہت چرچا ہے یوں سمجھ لیجئے کہ سورج میں ہر لمحے لاکھوں، کروڑوں ایٹمی دھماکے ہورہے ہیں اور وہی توانائی روشنی اور حرارت کی شکل میں ہم تک پہنچ رہی ہے، سورج زیادہ تر توانائی دو طرح کے ایٹمی عمل سے حاصل اور خارج کرتا ہے دونوں میں ہائیڈروجن ہیلیم گیس میں تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس کا کچھ حصہ تباہ ہوکر توانائی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ صرف ایک سیکنڈ میں سورج ۴۵ لاکھ ٹن ہائیڈروجن تباہ کرڈالتا ہے۔ اس کے باوجود سائنسدانوں کے اندازے کے مطابق سورج کئی ارب سال میں ابھی تک صرف ۳۰ فی صد ہائیڈروجن کو ہیلیم اور دوسرے عناصر میں تبدیل کرسکا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی سورج اپنے نصف النہار پر بھی نہیں پہنچا ہے۔

سورج کس طرح وجود میں آیا اس میں کون کون سی گیس اور مائعات پائے جاتے ہیں اور یہ اتنا چمکتا ہوا کیوں دکھائی دیتا ہے۔؟

مہرین فاطمہ گوھر، نارتھ ناظم آباد کراچی

سائنسدانوں نے حساب لگایا ہے کہ سورج اب سے ۵ ارب سال پہلے وجود میں آیا۔ جب سورج پیدا نہیں ہوا تھا۔ تو کائنات کے اس حصے میں ہائیڈروجن گیس ہر سُو یکساں طور پر بکھری ہوئی موجود تھی۔ اس ہائیڈروجن نے روشنی یعنی توانائی کے ایک بیکراں سمندر میں جنم لیا اور روشنی مادے میں بدل گئی۔ یہ روشنی کہاں سے آئی اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں ہر سائنسدان خدا کو کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ہائیڈروجن کے اس سمندر میں کسی جگہ کوئی گڑبڑ پیدا ہوئی اور باہمی کشش ثقل کے باعث ہائیڈروجن کے کچھ ایٹم ایک جگہ اکٹھے ہوگئے چونکہ اس ڈھیر کی کشش ثقل گردو پیش میں موجود علیحدہ علیحدہ ایٹموں سے زیادہ تھی اس لیے قریبی ایٹم اس ڈھیر کی طرف کھنچنے لگے۔ جوں جوں یہ ڈھیر بڑا ہوتا گیا اس کی کشش ثقل بڑھتی گئی اور اس کا دائرۂ اثر وسیع ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ کروڑوں میل دور کے ایٹم بھی آکر اس ڈھیر سے ملتے گئے اور بالآخر اس ڈھیر نے توانائی اور حرارت کے ایک عظیم سمندر کی شکل اختیار کرلی۔

سورج میں زیادہ تر ہائیڈروجن گیس پائی جاتی ہے جو کیمیائی عمل کے نتیجے میں ہیلیم گیس میں تبدیل ہوتی رہتی ہے اس کے علاوہ بھی چند عناصر بہت قلیل مقدار میں پائے جاتے ہیں، لیکن بہت غالب مقدار ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس ہی کی ہے۔ اس کے اتنے چمکنے کی وجہ بھی جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے یہی ہے۔ کہ اس میں ہر وقت ایٹمی دھماکے ہوتے رہتے ہیں جو بڑی مقدار میں توانائی خارج کرتے ہیں۔ یہی اس کی چمک دمک کا سبب ہے۔

ٹیلی وژن کن بنیادی اصولوں پر چلتا ہے؟

فاطمہ مسعود، سٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

ٹیلی وژن کا عمل بنیادی طور پر ریڈیو کا ہی عمل ہوتا ہے یعنی آواز کی لہروں کو برقی لہروں میں تبدیل کر کے فضا میں بکھیر دینا۔ ٹیلی وژن اور ریڈیو میں فرق یہ ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن میں آواز کی لہروں کے علاوہ روشنی کی لہروں کو بھی برقی اور ریڈیائی لہروں میں تبدیل کر کے فضا میں بکھیر دیا جاتا ہے۔ پھر ان لہروں کو ٹیلی ویژن پر وصول کر کے صوتی یعنی آواز کی لہروں اور روشنی کی لہروں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن، دو یونانی الفاظ، ٹیلی اور ویژن سے مل کر بنا ہے۔ ٹیلی کے معنی "دُور" اور ویژن کے معنی "دیکھنا" ہیں گویا ٹیلی ویژن کے معنی ہوئے "دور دیکھنا" یا "دُور کی چیز دیکھنا" اس عمل میں ایک دھات سیلینیم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ۱۸۷۳ء میں سائنسدانوں نے مختلف دھاتوں کی خصوصیات پر تحقیق کے دوران سیلینیم کی یہ خوبی دریافت کی کہ اگر اس پر روشنی ڈالی جائے تو اس کی الیکٹریکل کنڈکٹویٹی یعنی برقی رو کی ترسیل کی صلاحیت میں فرق پیدا ہو جاتا ہے' ٹی وی کیمرہ میں روشنی کی شعاعوں کو فوٹو الیکٹریکل عمل کے ذریعے عکس یا تصویر کے چھوٹے چھوٹے نقطوں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ٹی وی کیمرہ کے ذریعے روشنی کی شعاعوں کو برقی جھٹکوں یا ELECTRICAL IMPULSE میں تبدیل کیا جاتا ہے اور اس کے مختلف طریقے استعمال ہوتے ہیں جن میں سے ایک کو سیلینیم کہتے ہیں۔ سیلینیم میں حساس طشتری یعنی وہ حصّہ جو روشنی کی شعاعوں کی تمازت کو محسوس کرتا ہے مائیکا کی شیٹ پر مشتمل ہوتی ہے اس طشتری کے سامنے کے حصّے پر روشنی سے متاثر ہونے والی دھات کے لاکھوں ننھے منے ذرّات لگے ہوتے ہیں جب روشنی کی شعاعیں ان ذرّات پر پڑتی ہیں تو یہ ذرّات برقی ارتعاش پیدا کرتے ہیں اور یہ ارتعاش تمازت سے بالراست تناسب میں ہوتا ہے یعنی جہاں روشنی زیادہ ہوگی وہاں برقی ارتعاش بھی زیادہ ہوگا۔ ایک پیچیدہ عمل کے نتیجے میں یہ لہریں ٹیلی ویژن کے پردے پر سینکڑوں لائنوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور ہر لائن سینکڑوں روشن اور تاریک نقطوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ لائنیں ایک سیکنڈ میں تقریباً ۳۰ مرتبہ بنتی اور مٹتی ہیں اس طرح اگرچہ ٹی وی اسکرین پر تصویر ساکت ہوتی ہے اور نقطوں کی شکل میں ہوتی ہے لیکن ہماری آنکھ کے پردے پر اس تصویر کا اثر ۱/۱۶ سیکنڈ یا سیکنڈ کے سولھویں حصّے تک رہتا ہے اس لیے ایک تصویر کا اثر ختم ہونے سے پہلے دوسری تصویر بن جاتی ہے۔ اور ہمیں یہ نقطے حرکت کرتی ہوئی تصویروں کی شکل میں محسوس ہوتے ہیں۔

رنگین ٹیلی ویژن میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ رنگین ٹی وی سیٹ بیک وقت تین عکس وصول کرتا ہے جو لال، ہرے، اور پیلے رنگ میں ہوتے ہیں۔ یہ تینوں عکس چونکہ ایک ہی اسکرین پر ترتیب پاتے ہیں۔ اس لیے ہماری آنکھ اور حواس کو ان کا مجموعی تأثر موصول ہوتا ہے اور صرف ان تینوں رنگوں میں درجنوں رنگ محسوس ہوتے ہیں۔ حالانکہ رنگین ٹیلی ویژن پر صرف لال، ہرے، اور نیلے رنگ میں تصویر بنتی ہے۔

دودھ اور مکھن کا شیریں احساس
Royal
بٹر ٹافی
Butter Toffee
Royal
چاکلیٹ ٹافی
Chocolate Toffee
Royal
رائل کنفیکشنری انڈسٹریز 22/24۔سی۔ایس۔آئی۔ای۔گوجرانوالہ

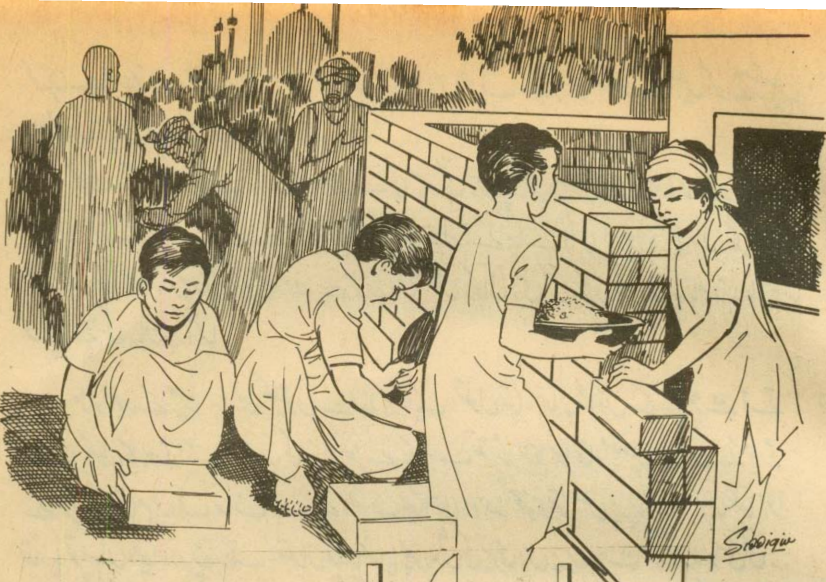

دیوار

مصطفیٰ چاند

وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں ہر سمت سبزہ ہی سبزہ اُگا تھا۔ صرف پگڈنڈیوں سے مٹّی کا خاکی سینہ جھلکتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس گاؤں میں ہر جگہ ہریالی تھی پھر قدموں کی آمد و رفت نے یہاں راستوں کا تعیّن کیا۔ کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ کر جب اس گاؤں پر نظر ڈالی جاتی تو یوں لگتا جیسے ہرے بھرے سے قالین پر مٹّی کے بنے ہوئے سانپ بل کھاتے ہوئے جا رہے ہوں، اندر ہی اندر، دُور ہی دُور،

اسی گاؤں کے عین وسط میں ایک شفّاف نہر بڑی خاموشی کے ساتھ بہتی رہتی۔ اکثر مائیں اپنے بچوں کو نہر کے کنارے بٹھا کر ایک فرضی کہانی سُناتیں کہ نہر پہلے ایک حسین لڑکی تھی وہ سارا سارا دن باغوں میں اچھلتی کودتی رہتی۔ ایک ایسے ہی دن جب وہ اپنی امّی سے پوچھے بغیر گھر سے نکلی تو ایک دیو اُسے اُٹھا کر لے گیا اور پیاری سی نہر کی زبان کاٹ دی، اس کے بعد سے نہر خاموش ہو گئی۔ دیو نے کہا تھا کہ نہر کئی صدیوں تک اسی طرح خاموش سفر کر کے جب اپنی منزل پر پہنچے گی تب دیو نہر کو اس کی کاٹی ہوئی زبان واپس کر دے گا۔ وہ دن اور آج کا دن نہر خاموشی سے سفر

کررہی ہے۔ بچّے اس فرضی کہانی کو سُن کر سہم جاتے اور اس خوف سے کوئی شرارت نہیں کرتے کہ کہیں دیوائن کی زبان بھی کاٹ کر نہ لے جائے۔

گاؤں کے دائیں جانب ایک سبز رنگ کی مسجد تھی جس پر جنگلی کبوتر ہر وقت منڈلاتے رہتے۔ یہ مسجد اپنی طرز کے اعتبار سے مزار سے ملتی جلتی تھی۔ گاؤں سے آنے جانے والی لاریوں نے اس جگہ کا نام مزار مسجد رکھّا ہوا تھا۔ یوں بھی یہ مسجد دور سے مزار ہی کی شکل دکھائی دیتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ نام اتنا عام ہوگیا کہ بچّے بچّے کی زبان پر آگیا۔

مزار مسجد کے عین سامنے کھیتوں سے ملا ہوا ایک اسکول تھا۔ جہاں گاؤں کے بچّے پڑھنے آتے تھے۔ اسکول کا بورڈ ایک طرف کی بنیاد اُکھڑنے کے سبب تقریباً لٹکا ہوا تھا۔ مسلسل بارشوں نے بورڈ کے اوُپر سے تمام حروف صاف کردیئے تھے۔ صرف جھکا ہوا وہ حصّہ محفوظ تھا جس پر پرائمری اسکول لکھّا ہوا تھا۔ یا تو یہاں اچھا اور پکّا رنگ استعمال کیا گیا تھا یا پھر بارش کی تیزی اس پر براہِ راست اثر انداز نہ ہوسکی تھی۔

اسکول کی تین دیواریں سرخ اینٹوں سے چُنی گئی تھیں جن پر کچھ بچّوں نے کوئلے کی مدد سے اسکول کا نام لکھا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ ہی سفیدے کے درخت بلندیوں کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے مگر جب بھی کوئی تیز ہوا کا جھونکا آتا تو وہ یوں دوہرے ہوکر جھول جاتے جیسے وہ ربڑ کے بنے ہوں البتّہ اسکول کی چوتھی دیوار گری ہوئی تھی۔ بنیاد کی چند اینٹیں آڑی ترچھی کرکے گارے کا سہارا دے کر کھڑی کی گئی تھیں لیکن ان کے درمیان بھی بہت خلا تھا پھر گائے، بھینس بھی اُس طرف آنکلتیں تو بالشت بھر دیوار بھی ختم ہو جاتی۔ گری ہوئی دیوار کی جگہ پر مٹی کا ڈھیر تھا جس نے زمیں بوس اینٹوں کو ڈھانپ لیا تھا۔ اب وہاں صرف ایک ٹیلا سا بن کر رہ گیا تھا جس سے کسی کو اندازہ نہ ہوتا تھا کہ اس کے اندر گاؤں کے اسکول کی دیوار دفن ہے۔

گرمیوں کا زمانہ تو اسکول میں اتنا سخت نہیں ہوتا تھا جتنا سردیوں کا۔ غریب کسانوں کے کمزور سے بچّے پھٹے پرانے کپڑوں میں اسکول تو جاتے مگر جب ٹوٹی ہوئی دیوار کی سمت سے سرد ہوا کے جھونکے ان کے چہروں سے ٹکراتے تو ٹھٹھرتے ہوئے بدن کا ایک ایک رونگٹا تن جاتا۔ بچّے دیوار کو اس طرح دیکھتے جیسے وہ ان کی رحم طلب نظروں کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوگی اور ہوا کے برفیلے تھپیڑوں کو اپنے سینے پر روک لے گی مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔

اس دیوار کو گرے تین فصلیں گزر چکی تھیں اب چوتھی فصل کھیتوں میں سر اٹھائے کٹنے کی منتظر تھی لیکن یہ دیوار اُٹھ نہ سکی تھی۔

سرد ہوا کے اس عذاب سے بچنے کے لئے بچے جلد اپنے گھروں سے نکل جاتے تاکہ مناسب جگہ بیٹھ کر اس سزا سے دور رہیں۔ لیکن آخر میں بیٹھنے والے بچے بدستور کٹکٹاتے رہتے۔ ایسے میں یوں لگتا جیسے دور کسی چٹانی پتھر پر کوئی ضربیں لگا رہا ہو۔

حاکم بابا کا بیٹا ناصر دیر تک سونے کا عادی تھا جبھی وہ اسکول دیر سے پہنچتا اور سفیدے کے درختوں کی طرح ہوا کے ہر ہر جھونکے پر لرزتا رہتا۔ ایسے میں وہ دل ہی دل میں یہ دُعا ضرور مانگتا کہ اللہ جی! اسکول کی ساری دیواریں گرادے تاکہ اسکول ہی ختم ہو جائے۔ کم از کم اس سزا تو نجات مل جائے گی۔ پھر وہ ہر رات سوتے ہوئے زیرِ لب کہتا۔" اللہ جی! ایسا مینہ برسا کہ سب کچھ بیٹھ جائے۔ اسکول بھی اور گاؤں کی قبریں بھی"

اسے گاؤں کے قبرستان سے بھی بہت خوف آتا تھا کیونکہ اسی راستے سے ہو کر وہ اسکول پہنچتا تھا۔ قبروں کے اُبھرے ہوئے سینے دیکھ کر اُسے یوں لگتا جیسے 'مردے' اُکڑوں بیٹھے اُسے بلا رہے ہوں۔ کبھی کبھی تو اس کا دل یہ سوچ کر دہل جاتا کہ اگر قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی مردہ اس کی ٹانگ کھینچ لے تب کیا ہوگا.....؟

اِن تمام باتوں کو سوچ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسکول کی دیوار ہی تمام معاملات میں اُلجھی ہوئی ہے بس یہ گر جائے تو نہ اسکول کھلے گا، نہ قبرستان کے راستے اسکول جانا پڑے گا سب سے بڑھ کر ہوا کے موت سے بھی زیادہ سرد ہاتھوں سے نجات مل جائے گی۔

اس نے دعائیں تو بہت مانگیں اور بارشیں بھی خوب ہوئیں کہ سب جَل تھل ہو گیا مگر اسکول کی ساری تو کیا ایک دیوار بھی نہ گر سکی۔

اُس روز بھی ناصر کو دیر سے آنے کی وجہ سے ٹوٹی دیوار کے عین درمیان بیٹھنے کی جگہ ملی۔ وہ ہوا کے سب جھونکے اپنی موٹی سی کوٹ سے روک رہا تھا مگر پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے کوٹ میں چھید ہو گئے ہوں جن سے برف کے نظر نہ آنے والے گولے بدستور کوٹ میں اُتر کر اُس کے خون کو منجمد کر رہے ہوں۔ یہی نہیں بلکہ وہ ابھی دوات میں سرکنڈے کا موٹا قلم ڈبو ہی رہا تھا کہ اچانک وہ قلابازی کھا کر گرا۔ یہ تو اُس کو بعد میں پتا چلا کہ ماسی مریم کے آوارہ بکرے اس پر چڑھ دوڑے تھے۔ ایک سینگ تو اُسے اس زور لگا تھا کہ اب تک پسلیوں سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایسے میں اس نے تینوں دیواروں کو دیکھا تو اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

"کیوں نہ ہم ان دیواروں کو خود گرا دیں"۔ دماغ میں گونجنے والی اس سرگوشی نے اُس کو پسلیوں کی ناقابلِ

برداشت تکلیف سے بھی نجات دلادی۔ وہ سب کچھ بھول کر اسی پر غور کرنے لگا۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ ماسٹر وقار کیا پڑھا رہے ہیں یا اشتیاق کو کس لئے سزا دی گئی۔ بس وہ تو دیواروں کو گرانے کے متعلق مسلسل سوچ رہا تھا۔

جب چھٹی ہوئی تو وہ اپنی ٹولی کے ہمراہ نہر کے کنارے جا بیٹھا۔ وہ چھٹی کے بعد عموماً اسی جگہ بیٹھ کر اپنے مسائل حل کرتے تھے اس وقت بھی ان کے درمیان اسکول کی دیوار موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی۔

"مگر صادق! اتنی موٹی دیوار گرے گی کیسے...؟ کاشف جو پورے گاؤں میں کاشو گھامڑ کے نام سے مشہور تھا بڑی دیر کی سنجیدگی کے بعد بولا۔

صادق چند لمحے خاموش رہا وہ بھی تو نہیں جانتا تھا کہ اتنی موٹی دیوار کیسے گرے گی۔

"یار تو نے ماسٹر صاحب کی بات نہیں سنی کیا" گڈو نے چھوٹے چھوٹے کنکر نہر میں پھینکنے کے بعد کہا۔

"کون سی بات"؟ احتشام نے بے تابی سے کہا۔

"ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ جب انسان کچھ کرنے کا ارادہ کرے تو بڑے بڑے پہاڑ لرز اُٹھتے ہیں سب مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں" گڈو نے عالمانہ انداز میں کہا۔

"میں تو نہیں مان سکتا کہ پہاڑ لرزتے ہوں گے کیونکہ پہاڑ تو بے جان ہوتے ہیں" متقی نے اپنی دانست میں بہت پتے کی بات بتائی۔

"ہو سکتا ہے یار! جب ماسٹر صاحب کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے" ناصر بھی تھک کر بولا۔

"مگر ہم دیوار گرائیں گے کس طرح؟"

"اور اگر ماسٹر ارشاد نے دیکھ لیا تو...؟" کاشف اور بدر نے بہ یک وقت سوالات کئے۔

"بس یہی تو مسئلہ ہے" خاور نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ وہ سب الگ الگ بیٹھے اسی مسئلے پر سوچ رہے تھے۔

چند لمحوں بعد وقار نے خاموشی کو توڑا۔ "یار ناصر! میری ماں کہتی ہے کہ سچے دل سے جو بھی دُعا مانگو قبول ہو جاتی ہے۔ کیوں نہ ہم بھی دُعا مانگیں"

"یار! نہ معلوم کیسی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ میں نے تو اتنی مرتبہ دُعا مانگی مگر آج تک میری دُعا قبول نہیں ہوئی" ناصر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"تو نے سچے دل سے دُعا نہیں مانگی ہوگی۔ جبھی تو قبول نہیں ہوئی" آصف نے سمجھانے کے انداز

میں کہا۔

"لیکن سچے دل سے دُعا کیونکر مانگی جا سکتی ہے۔؟" راشد نے عجیب سا سوال کیا۔

"کیا مطلب ....؟" گڈو چونک کر بولا۔

"مطلب یہ کہ دل کو سچا کیسے کیا جائے ....؟" راشد نے وضاحت کی۔

"میرے خیال میں تو پہلے ہمیں جھوٹ بولنا چھوڑنا چاہیئے۔ شاید جبھی دل سچا ہو؟" خاور نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"اوہ اس میں تو بہت دن لگ جائیں گے؟" شانی نے پریشانی سے کہا۔

"نہیں، بہت دن کیوں؟ ہم آج ہی سے جھوٹ بولنا چھوڑدیں گے؟" پھر یقیناً ہمارا دل صاف ہو جائے گا۔ اس سے اگلے روز ہم دُعا مانگیں گے اور نئے دن اسکول کی دیوار گر چکی ہو گی۔ اسکول بند ہو جائے گا۔ اور یوں .....!"

سب بُت بنے کھڑے تھے اور اُس کی باتیں سن رہے تھے۔

پھر جب وہ سب اپنے اپنے گھر واپس ہوئے تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے گناہوں سے توبہ اور جھوٹ نہ بولنے کا عہد کر چکا تھا۔

اگلے ہی دن انہوں نے نیک کاموں کا آغاز کر دیا۔ کسی نے گاؤں میں پانی بھرنے کا کام شروع کیا تو کوئی ڈھور ڈنگر لے کر انہیں چرانے نکل گیا۔

انہی دنوں ماسٹر خالد کے بھانجے رضوان کا شہر میں موٹر سائیکل پر ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ تیز رفتاری نے رضوان کی زندگی اس سے چھین لی تھی۔ چنانچہ ماتم والے گھر میں جتنے کام تھے انہی لوگوں نے کیے۔

دو ہفتے بعد جب وہ دوبارہ آپس میں ملے تو ہر ایک نے اپنے نیک کاموں کی تفصیلات بتا کر اپنے دل کے پاک و صاف ہونے کا یقین دلایا۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ نمازِ جمعہ کے بعد وہ سب صحن میں لگے پیپل کے بڑے درخت .... کے نیچے آ کھڑے ہوئے۔ اور دُعا مانگنے لگے۔

"اللہ جی"! اب ہمارا دل صاف ہو گیا ہے اور ہم سچے دل سے دعا مانگ رہے ہیں۔ سُنا ہے کہ تو بچوں کی سچے دل سے مانگی دُعا ضرور قبول کرتا ہے۔ بس آج رات اتنی تیز بارش دے کہ اسکول کی

ساری دیواریں گر جائیں۔ اللہ جی! اسکول کی ٹوٹی دیوار سے اتنی ٹھنڈی ہوا آتی ہے کہ سانس تک جم جاتا ہے۔ اسکول کی دیوار گرے گی تو اسکول ختم ہو جائے گا۔ یقیناً پھر وہاں کوئی پڑھانے نہیں آئیگا۔

وہ ابھی دعا مانگ ہی رہے تھے کہ کوئی تیزی سے اُن کے پیچھے سے گزر گیا۔ انہوں نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن وہ جانے والے کو نہ پہچان سکے۔ جمعہ کے روز تو مسجد میں بے انتہا لوگ ہوتے ہیں اور اتنے لوگوں میں کسی کی تلاش خاصا مشکل کام ہے۔

دعا مانگنے کے بعد جب وہ گھر آئے تو خاصے مطمئن تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ ان کی دعا ضرور قبول ہوگی۔

جب صبح ہوئی تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ آسمان گرج رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے قیامت بپا ہوگئی ہو۔ ہر سمت سیاہ بادلوں کا گھیراؤ تھا جو ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل بارش کے بعد آسمان صاف ہوا۔ اس عرصے میں گاؤں کا سبزہ کھِل اُٹھا تھا۔ ہرے ہرے پتوں پر بارش کے قطرے چمک رہے تھے درخت پر ہوا کے جھونکے پانی کی پھوار برسائے۔ پرندے چہچہاتے ہوئے فضاؤں میں بلند ہو رہے تھے۔ سورج کی چمکتی روشنی بھی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

بارش کے تھمتے ہی لوگ گاؤں میں پھیل گئے۔ اسی وقت بوٹی نے آکر خبر دی۔

"پیرو چاچا اسکول کی دیواریں ڈھ گئیں" بوٹی گاؤں کا ملنگ سا لڑکا تھا۔ سارا سارا دن گاؤں میں گھومتا۔ لوگ اسے اپنے اپنے گھر سے کھانا کھلا دیا کرتے تھے اور رات ہوتے ہی وہ مزار مسجد میں پڑ کے سو رہتا۔ اس طرح کے اطلاعی کام وہی کرتا تھا۔

ناصر نے سُنا تو وہ خوشی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ کوئی بہت بڑا خزانہ لگ گیا ہو۔ وہ اگلے ہی لمحے اُٹھا اور گاؤں کی پگڈنڈیوں پر کیچڑ میں اترتا ہوا سرپٹ بھاگنے لگا۔

اچانک وہ سامنے سے آنے والی ٹولی سے ٹکرا گیا۔ یہ اُسی کے ہمجولی تھے جو اسے اِس بات کی خبر دینے جا رہے تھے کہ اسکول کی دیواریں گر گئیں۔

"مبارک ہو .....!" وہ خوشی سے چلا کر سب سے لپٹ گیا۔

"ہماری دعا قبول ہوگئی....." بدر نے کیچڑ میں دھنسے پیر پر گرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں نے کہا تھا نا سچّے دل سے مانگی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے.... " وقار نے اس کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لئے کہا۔ اور پھر سب بڑے پتھر پر چڑھ کر اسکول کی دیواروں کی بکھری ہوئی اینٹیں دیکھنے لگے۔ اب وہاں ایک دیوار بچی تھی، صرف ایک دیوار!

تین دن تک اسکول بند رہا۔ دونوں دیواریں اس طرح گری تھیں کہ ساری اینٹیں اندر ڈھیر ہوگئی تھیں۔ سب کو یقین ہوگیا تھا کہ اب یہ دیواریں کبھی نہ اُٹھ سکیں گی۔

اسی دن جب مزار مسجد سے لوگ نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ غلام نبی کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے امامِ مسجد نے کہا۔ "کیا بات ہے غلام نبی صاحب! آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں....؟"

غلام نبی نے چند لمحوں تک زمین کو گھورنے کے بعد افسردہ سے لہجے میں کہا۔ "ہاں میری میری ماں بیمار ہے...."

"کیا....؟" کئی نمازی جو اُن کے اطراف سے گزر رہے تھے چلتے چلتے رُک گئے۔ غلام نبی گاؤں کے معمّر اور دین دار لوگوں میں شمار ہوتے تھے پورے گاؤں میں اپنے اچھّے اخلاق کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کی اس بات پر تقریباً پورا گاؤں اُمڈ آیا۔

بوٹی نے پورے گاؤں میں اطلاع کردی اور آن کی آن میں سب لوگ اُن کے پاس جمع ہوگئے۔

"کیا ہوا غلام نبی انہیں....؟ چوہدری افضل نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"وہ.... وہ زخمی ہیں.... اُس کا چہرہ چھلنی ہے...." غلام نبی کی آواز بھرّا گئی۔

کیا کوئی حادثہ پیش آگیا....؟ بیک وقت کئی آوازیں اُبھریں۔

"ہاں.... حادثہ....! غلام نبی نے اپنی چڑھتی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا: "آیئے میرے ساتھ۔!"

تمام لوگ خاموشی کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ سب کے چہرے افسردہ تھے۔ اُونچے نیچے راستوں سے ہوتے ہوئے وہ سب دائیں طرف مڑ کر اچانک اسکول کے احاطے میں داخل ہوگئے۔

"یہ ہے میری ماں جس نے مجھے حرفوں کی شناسائی دی۔ جس نے مجھے اندھیروں کے دُکھ سے رہائی دی جہاں میں بے زبان داخل ہوا اور اس نے مجھے زبان دی۔ اس نے آپ کے، میرے، ہم سب کے ذہنوں کو منوّر کیا، لیکن آج جب ہم نے اس کی گود چھوڑ کر اپنے قدموں پر چلنا شروع کیا تو اُسے بھلا بیٹھے"

"دیکھیئے! دیکھیئے اس کا دامن کتنا خالی ہے اس کے ماتھے پر کتنے زخم ہیں۔ ہر زخم رس رہا ہے۔ میری ماں آپ کی ماں خاموش ہے۔ مائیں تو کبھی شکوہ نہیں کرتی نا! بس سب کچھ خود ہی سہتی ہیں نا؟ یہ بھی آپ سے

کچھ نہیں کہے گی۔ کبھی آپ سے شکوہ نہیں کرے گی۔ یہاں تک کہ اس کا ایک بازو اور گر جائے گا۔ پھر ایک اور گر جائے گا مگر آپ کوئی چیخ نہیں سنیں گے۔ کبھی آہ نہیں سنیں گے مگر کیا ہمیں آئندہ آنے والوں کے لئے اس ماں کی ضرورت نہیں پڑے گی؟ کیا یہ یوں ہی زمین بوس ہو کر کھیتوں سے جا ملے گی؟ مگر یاد رکھیئے!! اس زمین پر کوئی حل نہ چلا سکے گا۔ دھرتی ماں کے سینے میں ایک زندہ ماں دفن ہوگی۔ اس پر کوئی فصل کھڑی نہیں ہوگی۔"

"ہے کوئی! ہے کوئی جو آپ میں سے آگے بڑھے اور ماں کے زخمی چہرے پر پھاہا رکھے۔ ہے کوئی جو اسے اپنی مضبوط بانہوں کا سہارا دے سکے۔ ہے کوئی جو اُسے زندہ دفن ہونے سے بچالے"!

غلام نبی مٹی پر گر کر بلک بلک کر رونے لگے۔ ان کا پورا وجود لرز رہا تھا اور چہرہ جذبات کی شدت سے تمتما رہا تھا۔

سب لوگ دم بخود کھڑے تھے یوں لگتا تھا جیسے سب کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ اسکول کی آخری دیوار پر ٹنگے تختۂ سیاہ میں سب کو اپنے چہرے سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ جگہ جگہ سے پلاسٹر اترا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ہر جگہ سے سرخ سرخ گرم خون ٹپک رہا ہو۔ ہر دیوار کے شگاف میں آنسو بھرے دکھائی دیتے تھے۔

"یاد رکھیئے"! غلام نبی نے آنسو سے تر چہرہ اٹھا کر کہا۔ "مائیں کبھی نہیں مرتیں۔ انہیں زندہ رہنا ہوتا ہے ان ستاروں کے لئے جنہیں اس دھرتی میں جگمگانا ہے اُن خوابوں کے لئے جن تعبیر کا خراج دینا ہے ہم سب کی ماں بھی کبھی نہیں مرے گی۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج میں اس دیوار کی پہلی اینٹ لگا رہا ہوں۔ کل تک اس جگہ ماں کا صحیح سالم وجود دوبارہ کھڑا ہوگا۔ آندھیاں اسے پھر گرائیں گی۔ ہم اسے پھر بنائیں گے۔ طوفان اسے پھر ڈھادیں گے ہم اسے پھر اٹھائیں گے یہاں تک کہ آندھیاں تھک جائیں گی اور طوفان اپنا رخ پھیر لیں گی۔

"آئیں آپ میں سے جو کوئی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے ان اینٹوں کو پھر سے بلندیوں کی طرف لے جائے۔ آیئے ہم ماں کے چہرے سے بڑھاپے کا نقاب نوچ پھینکیں۔ اس کی ضعیفی کھرچ ڈالیں۔ آیئے... آیئے....."

غلام نبی اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اینٹوں پر جھک گئے۔ گارے میں اینٹیں دب کر پھر سے ایک دیوار کی قبر بن چکی تھیں لیکن آج اُن تمام اینٹوں کو گارے سے نکالنا تھا۔ آج اینٹوں کے قبرستان کو ختم

کر دینے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔

اچانک جیسے سارے لوگ خواب سے جاگے ہوں۔

"غلام نبی صاحب! ہماری ماں کبھی نہیں مرے گی۔ ہم اس کی ضعیفی چھین لیں گے۔ اسے زندہ رہنا ہے ہماری آنے والی نسلوں کی انتہا تک!"

پھر سب کے سب اینٹوں پر اس طرح پل پڑے جیسے وہ سرخ مٹی کی بجائے سونے کی بنی ہوں۔

ناصر، گڈو، خاور، بدر، وقار سب دم سادھے کھڑے تھے۔

اچانک ہی ناصر کے ذہن میں ایک جھما کا ہوا۔ مائیں کبھی نہیں مرتیں۔ انہیں زندہ رہنا ہوتا ہے۔۔۔

وہ کچھ دیر بُت کی طرح کھڑا رہا اور پھر تیزی سے اینٹوں کی طرف لپکا۔

ناصر کے جاتے ہی خاور، بدر اور وقار نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں "یہ ہماری بھی تو ماں ہے۔۔۔۔"

پھر اگلے ہی لمحے وہ بھی اینٹوں پر پل پڑے۔ پورا گاؤں اسکول کے اطراف جمع تھا۔ کوئی گارا لا رہا تھا۔ کوئی پانی کے کنستر بھر رہا تھا۔ کہیں اینٹیں لپک لپک کر دی جا رہی تھیں۔ کہیں پلاسٹر ہو رہا تھا۔

گاؤں کے بڑے چھوٹے سب دیواروں کی تعمیر میں جٹے ہوئے تھے اور دیوار لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔

سورج سب کے سروں پر آگ برساتے ہوئے مغرب کی جانب بھاگا چلا جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد سروں پر سوار سورج پھسلتے پھسلتے اسکول کی دیوار کے پیچھے جا ڈوبا۔

ناصر اور اس کے تمام ساتھی بدستور کام میں لگے تھے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ اس روز دیواروں کے گرنے کی دعا غلام نبی نے سن لی تھی اور اس رات اسکول کی دیوار تیز بارش سے نہیں بلکہ غلام نبی کے خود اپنے ہاتھوں سے گری تھی۔

غلام نبی جانتے تھے کہ اگر دیوار نہ گرائی گئی تو ان سب کا دعا سے اعتقاد ختم ہو جائے گا۔ اور اب تو وہ سارے ہی اچھے کام کرنے کا عہد کر چکے تھے۔

اگلے دن جب مزار مسجد سے اذان کی آواز نے صبح ہونے کی نوید دی تو تمام ہی لوگ اُٹھ بیٹھے۔ اس رات بھی بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ مگر اس رات کی بارش کسی دیوار کو گرانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ کیونکہ آج اسکول کی دیواروں میں اینٹوں کی بجائے ماؤں کے شفیق چہرے نصب تھے۔

ٹرانزسٹر، ٹارچ اور کھلونوں کیلئے بہترین

الہ دین بیٹری سیل

زیادہ قوّت — زیادہ دیرپا

مکمل طور پر قابلِ اعتماد - لیک پرُوف

856.MIL 5

PARAGON

امّ رباب جعفری

دائرۂ معلومات

ہر سوال کا جواب ذیل میں دیے گئے چار اشاروں کی مدد سے دینا ہوگا۔ آپ کی سہولت کے لیے ہم نے ہر سوال کے درست جواب کو دائرے میں ہی کہیں لکھ دیا ہے اور کچھ اضافی نام بھی ساتھ ہی لکھ دیے ہیں، جن کا سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مقابلے میں شرکت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دائرے میں اپنے مطلوبہ جواب پر سوال نمبر لکھ دیجیے اور اصل دائرہ کاٹ کر ۲۰ جنوری تک ہمیں بھیج دیجیے۔ دائرے کے بغیر جواب قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔

① انبیائے کرام	(i) عمران (ii) حضرت ہارونؑ (iii) یدِ بیضا (iv) ہجرت
② صحابہ کرام	(i) حوارئ رسول (ii) حضرت صفیہؓ (iii) حضرت اسما بنتِ ابوبکرؓ (iv) عشرۂ مبشرہ
③ تاریخ اسلام	(i) ۱۷۳۹ء (ii) محمد شاہ رنگیلا (iii) تختِ طاؤس (iv) ۱۷۴۷ء
④ تاریخ پاک و ہند	(i) روہیلہ (ii) ۱۸۵۷ء (iii) بہادر شاہ ظفر (iv) نیپال
⑤ تحریکِ پاکستان	(i) ۱۸۱۷ء (ii) آثار الصنادید (iii) علی گڑھ (iv) ۱۸۹۸ء
⑥ پاکستان کی عظیم شخصیات	(i) ہانگ کانگ (ii) شمشیرِ اعزاز (iii) ۱۹۶۵ء (iv) نشانِ حیدر
⑦ پاکستان کے شہر	(i) شکرپڑیاں (ii) شاہ فیصل مسجد (iii) امام بریؒ (iv) دامنِ کوہ
⑧ عالمِ اسلام (شخصیات)	(i) روح اللہ (ii) ایران (iii) ۱۹۷۹ء (iv) قم
⑨ عالمِ اسلام (ممالک)	(i) ریاض (ii) ابنِ سعود (iii) کلمۂ طیبہ (iv) شاہ فہد
⑩ دنیا کے بڑے شہر	(i) ہالینڈ (ii) شمالی کالونیز (iii) ۹۶ جزیرے (iv) دارالحکومت
⑪ عالمی شخصیات (۱)	(i) اٹلی (ii) ۱۸۸۳ء (iii) جنگِ عظیم (iv) ۱۹۴۵ء

(۱۲) عالمی شخصیات (۲)	(i) فرانس (ii) پینسلوانیا گزٹ (iii) امریکہ (iv) برقی موصل
(۱۳) مشہور خواتین	(i) ملکہ (ii) دی گریٹ (iii) ۱۷۹۶ء (iv) روس
(۱۴) مسلم سائنسدان	(i) الحاوی (ii) چیچک اور خسرہ (iii) رے (iv) ۹۲۵ء
(۱۵) سائنس کی دنیا	(i) ۱۷۶۶ء (ii) کلر بلائنڈ (iii) جزوی دباؤ کا نظریہ (iv) ایٹمی نظریہ
(۱۶) مشہور کھلاڑی	(i) ۱۲ (ii) ۳۳۷ (iii) لٹل ماسٹر (iv) ۴۹۹
(۱۷) عالمی ادب	(i) بمبئے (ii) KIM (iii) نوبل انعام (iv) ۱۹۳۶ء
(۱۸) اردو ادب	(i) نواب شمس الدین (ii) ذوق (iii) دہلی (iv) اقبال
(۱۹) علاقائی ادب	(i) اکوڑہ (ii) اورنگ زیب (iii) شہباز خان (iv) پشتو
(۲۰) فنون لطیفہ	(i) ۱۷۵۶ء (ii) موسیقار (iii) آسٹریا (iv) ۱۷۹۱ء

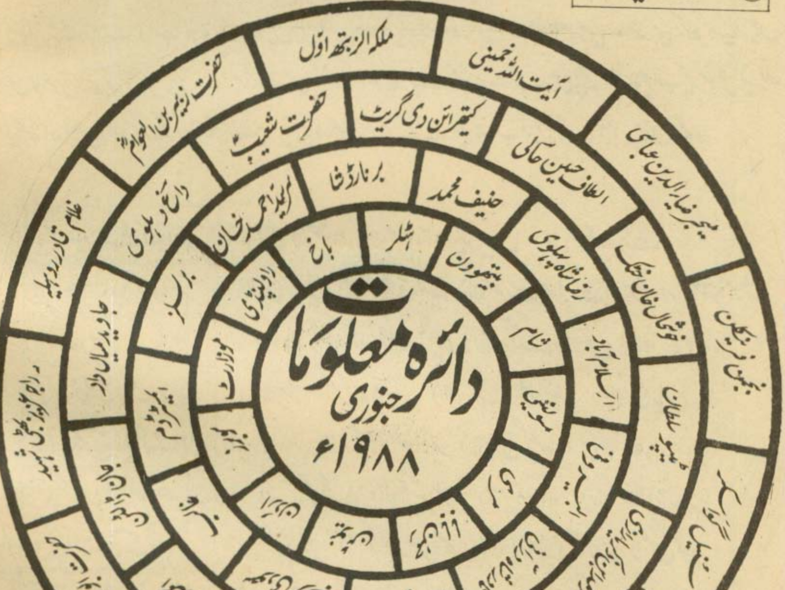

یہ میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
مستقبل کی بڑی ذمّہ داریوں کے لئے ابھی سے اپنے ذہن کو تروتازہ اور جسم کو توانا رکھیے
غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔
سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ .... مگر
دُودھ تو پیو
قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں کیلشیمؔ، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجوا شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھّی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دو بار دودھ پینا اپنی عادت بنا لیجئے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔
یوں گویا۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا
اشتہار برائے بہبود اطفال: منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی، کراچی

MASS

دائرہ معلومات نومبر ۱۹۸۷ء کا درست حل

① حضرت اسمٰعیلؑ ② حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ ③ محمود غزنوی ④ بہادر شاہ ظفر
⑤ لیاقت علیخان ⑥ ڈاکٹر عبدالسلام ⑦ حیدرآباد ⑧ کمال اتاترک
⑨ ایران ⑩ دمشق ⑪ جنرل ڈیگال ⑫ سکندرِ اعظم ⑬ فلورنس نائٹ انگیل
⑭ الخوارزمی ⑮ رونجن ⑯ ہاشم خان ⑰ ٹالسٹائی ⑱ محمد حسین آزاد
⑲ شاہ عبداللطیف بھٹائی ⑳ وان گوف

۳ خوش نصیب ساتھی، جو بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حقدار قرار پائے

○ حمیرا فلک نازمریم ——— فیڈرل بی ایریا۔ کراچی
○ منصور احمد ——— گوجی شاہو۔ لاہور
○ سید جاوید حیدر شاہ ——— سیٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

درست جوابات ارسال کرنے والے ذہین ساتھیوں کے نام

○ مجید عادل مجید سونی۔ آدم جی نگر۔ کراچی ○ محمد عمران ناظم، فیڈرل بی ایریا، کراچی ○ محمد سعد فیصل، محمد سلمان حمزہ، رحیم یار خان
○ سلمان عبداللہ۔ رفاہِ عام سوسائٹی، کراچی ○ مقصود احمد صدیقی۔ اورنگی ٹاؤن کراچی ○ محمد امین سیف الملوک، حسینی منزل، سانگھڑ
○ محمد سلمان فاروقی، نارتھ ناظم آباد، کراچی ○ محمد کامل، چوڑی پاڑہ، ٹنڈوالہ یار ○ عزیز اقبال صدیقی، ملیر ہالٹ، کراچی
○ مرزا توصیف بیگ، شاہی بازار لاہور ○ سہیل صدیق، محلہ محمد پورہ، گوجرانوالہ ○ تصویر زہرا، لیاقت روڈ، راولپنڈی
○ محمد شکیل آفریدی، شیراکی۔ دڑہ آدم خیل ○ حسن مہدی خراسانی، انچولی، کراچی ○ شارق شمیم، آگرہ تاج کالونی، کراچی
○ فیصل مختار، کیڈٹ کالج پٹارو ○ ہریش ٹی پردھانی، نواں کوٹ ○ خرم عبدالمجید بٹ، گلشن اقبال، کراچی
○ ایم رفیق زاہد، شاہی بازار، گوادر ○ ندیم میمن، فقیر کا پڑ، حیدرآباد ○ عاصم عبدالمجید بٹ، گلشن اقبال، کراچی
○ پرویز خان اشرف، رانگی واڑہ، کراچی ○ کاشف شکور غزل، سانگھڑ ○ محمد سہیل پاریکھ، گذر آباد، کراچی
○ شمیم شہاب الدین، ایف بی ایریا، کراچی ○ شمیم اختر کنول، شاہانی محلہ دادو ○ سید فہیم عابدی، اسٹیڈیم روڈ، کراچی

ایک غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

○ نذیر احمد، اورنگی ٹاؤن، کراچی ○ شفقت رحمٰن، اکوڑہ خٹک ○ بابر شاہ، ڈاکخانہ جسیاں ○ سید محمد تمیم، ملیر،

○ سعید احمد ، شالیمار، اسلام آباد
○ الیاس فاروقی، ملیر سوسائٹی، کراچی
○ ساجد جمیل، سعود آباد، کراچی
○ فرح ناز عزیز، جیلانی روڈ، سکھر
○ سید محمد کاشف ۔ سعود آباد، کراچی
○ عبدالعزیز شیخ، کریانہ بازار، سکھر
○ حسن شہیر خالد، ریلوے اسٹیشن حیدرآباد

○ فراز احمد ، گلشن اقبال، کراچی
○ ظہیر الٰہی بابر ، ریلوے کالونی کراچی
○ سید محمد طارق شاہ، شبقدر فورٹ ضلع پشاور
○ محمد سیف اللہ، بھابڑا، ضلع سرگودھا
○ فتحیہ صدیقی، لطیف آباد، حیدرآباد
○ سید حسین عابدی، ناظم آباد، کراچی

○ شکیل احمد، جمرود خیبر ایجنسی،
○ صاعقہ بانو، شادمان ٹاؤن کراچی
○ غلام حسین میمن، کھائی روڈ، حیدرآباد
○ جاوید شیخ، ملیر ہالٹ، کراچی
○ شاہنواز رحیم، ہیرآباد، حیدرآباد
○ سید حبیب علی زیدی، شیر شاہ، کراچی

آنکھ مچولی
کا
قہقہہ نمبر

عنقریب شائع ہونے والا ھے

جس میں ہنسنے ہنسانے والی کہانیاں، مُنہ چڑاتے کارٹون، گُدگُداتی نظمیں، قہقہہ بار لطیفے، مزیدار کالم، شگفتہ تصویریں اور ایسی تمام تحریریں جو ذہن کو ہلکا پُھلکا اور تر و تازہ کر دیتی ہیں۔

مایہ ناز مزاح نِگاروں کی نِگارشات

اُردو کے مزاحیہ ادب کا عطر

لیکن قہقہہ نمبر کیلئے کچھ آپ بھی تو لکھیئے۔

کوئی دلچسپ واقعہ، کوئی لطیفہ، کوئی مزاحیہ نظم یا کچھ بھی، ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ ادا کیا جائیگا۔

Reshma 222®
دھلائی کیلئے جدید ترین صابن
ریشماں 222®
میل کاٹنے کیلئے لیموں کے رس
اور آپکے ہاتھوں کی نازک جلد کی
حفاظت کیلئے ناریل کے تیل کی
اضافی خصوصیت کے ساتھ
AMIN
امین سوپ اینڈ آئیل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پوسٹ بکس: 4602، کراچی۔ فون: 237856-231343
MASS

گمشدہ جنت

ابن شہباز خان

رات بھر روتے اور بلکتے ہوئے آخر عامر نے ایک فیصلہ کرلیا۔

گھر چھوڑنے کا فیصلہ...!

صبح ہوتے ہی وہ اپنے بچپن کی ساتھی مانو کے ساتھ چپکے سے گھر سے نکل آیا۔ مانو اس کی پالتو بلی تھی اور والدین کے انتقال کے بعد وہی اس کی دوست اور غم خوار تھی۔

چلتے چلتے عامر بہت دُور نکل گیا اب دوپہر ہو رہی تھی اور اس کا مارے بھوک اور پیاس کے بُرا حال تھا۔ اسے یہ احساس بھی کچوکے لگا رہا تھا کہ اس کے ساتھ بے چاری مانو خواہ مخواہ بھوکی پیاسی گھسٹتی چلی آرہی ہے۔

"میں تو بھوک پیاس برداشت کرلوں گا مگر اس بے زبان اور معصوم جانور نے کیا قصور کیا ہے۔ جو میں اسے بھی بھوکا پیاسا رہنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ یہ بے چاری میری خاطر خواہ مخواہ گھسٹتی چلی آرہی ہے۔ مجھے اسے آزاد کر دینا چاہیئے آزاد رہ کر یہ اپنا دانہ پانی خود ہی تلاش کرے گی۔ کم از کم اس طرح بھوکی پیاسی تو نہیں رہے گی۔" عامر کو یہ سوچیں کچوکے لگاتی رہیں۔ اس نے مانو کو اپنی گود سے نیچے اُتار لیا۔

"پیاری مانو! میں اور تم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ تم نے اب تک میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ جس کے لیے میں تمھارا

بڑا شکر گزار ہوں۔ امی کے بعد تم ہی میرا سب کچھ تھیں۔ لیکن اب تمھارا مزید میرے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے۔ یہ خود تمھارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں مانو! تم چلی جاؤ۔" عامر کی آواز بھرّانے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مانو بدستور کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی لگ رہی تھیں۔

"میں کہتا ہوں، خدا کے لیے چلی جاؤ!" عامر نے ہاتھ سے مانو کو دھکیل دیا جواب میں مانو نے ہولے سے "میاؤں" کہا اور اپنی جگہ کھڑی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی عامر کے قریب آئی اور اس کے جسم سے اپنے آپ کو رگڑنے لگی۔ عامر نے ہاتھوں میں اُٹھا کر اُسے پیار کیا اور نیچے اُتار دیا۔ مانو نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور تیز تیز چلتی ہوئی ایک طرف بڑھنے لگی۔

وہ کئی گھنٹوں تک چلتی رہی۔

بالآخر تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ کے وہ ستانے لگی۔ بھوک اور پیاس سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور کمزوری کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے آگے دُھندلاہٹ سی آنے لگی تھی۔ کچھ دیر دم لے کر اس نے نیم غنودگی میں آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر سڑک کنارے چٹائی اور لکڑی کا ایک ہوٹل بنا ہوا تھا۔ وہ ہمّت کر کے اُٹھی اور آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگی۔ وہاں چارپائیوں کے نیچے بچا کھچا کھانا اور ہڈّیاں اور نچا ہوا گوشت پڑا تھا۔ وہ بھوک سے بے تاب ہو کر تیزی سے ایک بوٹی کی طرف لپکی اور اُسے بھنبھوڑنے لگی۔

شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا اور مانو کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھی۔

یکایک سامنے اُسے کچھ روشنیاں نظر آئیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس طرف چلنے لگی۔ قریب جا کر معلوم ہُوا کہ ایک بستی ہے۔ وہ ڈرے ڈرے انداز میں بستی کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ ایک غرّاہٹ سُن کر اپنی جگہ ٹھٹک کر رُک گئی...!

مانو کے جانے کے کافی دیر بعد عامر نے جُھکا ہوا سَر اُٹھایا۔

اُسے بھُوک کی شدّت نے بے تاب کر دیا تھا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اُس نے فوراً کچھ نہ کھایا تو اس کا دَم نکل جائے گا۔ وہ ہمّت کر کے اُٹھا اور آہستہ آہستہ اس راستے پر آگے بڑھنے لگا جہاں سے اس کی مانو گئی تھی۔ کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد وہ بھی اس ہوٹل جا پہنچا، جہاں سے مانو کو زندگی بچانے کے لیے کھانا مل گیا تھا۔ ہوٹل دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی اور مُرجھائی ہوئی صورت کھِل اُٹھی۔ شام کا جھٹپٹا چھانے لگا تھا۔ ہوٹل میں بچھی چارپائیوں پر بہت سے آدمی بیٹھے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ کچھ چائے پی رہے تھے اور کچھ خوش گپیاں کر رہے تھے۔

عامر نے جیب میں ہاتھ ڈالا، مگر جیب میں سوائے اسکول کارڈ کے کچھ نہ تھا اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی -

"پیسوں کے بغیر تو کھانا نہیں مل سکتا!" اس نے سوچا اور اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

"کھانا کھاؤ گے؟" ایک آواز سُن کر وہ چونکا اور جھکا ہوا سر اُٹھا کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ اس سے عمر میں کچھ سال بڑا ایک لڑکا اس کے پاس کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عامر نے مشینی انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ لڑکا اُسے بازو سے تھام کر ایک کونے والی چارپائی کی طرف لے گیا اور بٹھا کر کاؤنٹر کے پاس ہی بنے باورچی خانے کی طرف دوڑ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ چنگیری میں روٹیاں اور سالن کی پلیٹ لیے ہوئے آیا اور چارپائی کے ساتھ ہی پڑی بنچ پر رکھ کر اُسے کھانے کا اشارہ کیا۔

عامر نے ایک نظر اُسے دیکھا اور تیزی سے نوالہ توڑ کر سالن میں ڈبونے کے بعد منہ کی طرف لے جانے لگا کہ ایک مانو کی معصوم صورت اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔

"میاؤں!" مانو کی پیاری سی آواز آئی۔ اس کے چہرے پر دُکھ پھیل گیا اور اُس نے نوالہ پلیٹ میں ڈال دیا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" ہوٹل والا لڑکا چونک کر بولا

"بس... جی نہیں چاہ رہا" عامر کی آواز بھرّا گئی۔

"ارے بھائی! زندہ رہنے کے لیے کھانا تو ضروری ہے۔ چلو کھاؤ، شاباش۔ پھر میں سنوں گا کہ تمھیں کیا پریشانی ہے" لڑکے نے عامر کے کندھے کو تھپکتے ہوئے شفقت بھرے انداز میں کہا اور نوالہ پلیٹ سے اُٹھا کر اُسے کھلا دیا۔

"چھوٹے! روٹی دے دے" کوئی آدمی زور سے بولا، اور وہ لڑکا تیزی سے دوڑ گیا۔

عامر نے ایک نظر اُسے دیکھا اور آہستہ آہستہ کھانا کھانے لگا۔

عامر کھانے سے فارغ ہوا تو وہ لڑکا چائے کا کپ رکھ گیا۔ پھر وہ گاہکوں کو کھانا دینے میں مصروف ہو گیا۔ آخر کئی گھنٹوں بعد کھانے اور چائے کا دور ختم ہوا تو وہ لڑکا آستین سے پیشانی کا پسینہ صاف کرتا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔

"ہاں، اب بتاؤ۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"عامر"۔

"کہاں سے آئے ہو؟" لڑکے نے دوسرا سوال کیا اور عامر چپ بیٹھا رہ گیا۔ آخر لڑکے کے کریدنے اور اصرار کرنے پر اُس نے بتایا کہ والدین کے انتقال کے بعد چچا اور چچی جان اس کی پرورش کے لیے بچوں سمیت ان کے گھر منتقل ہو گئے مگر پھر ان کا رویہ اس کے ساتھ خراب سے خراب تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ تنگ آکر اُس نے گھر چھوڑ دیا۔

"بہت افسوس ہُوا" لڑکا ہمدردانہ انداز میں بولا "چلو، میں استاد سے تمھاری بات کرادوں۔ تمھیں یہاں کام بھی

مل جائے گا اور رہنے کو جگہ بھی، ٹھیک ہے؟" لڑکے نے اس کی رضامندی معلوم کی۔ عامر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

استاد راضی ہو گیا اور عامر "چھوٹو" بن کر ہوٹل میں رہنے لگا۔ وہ بھی اس لڑکے کی طرح گاہکوں کی خدمت کرتا۔ رات کو برتن دھوتا، اور وہیں ہوٹل میں پڑ رہتا۔ ہر ہفتے اُستاد اُسے کچھ رقم دے دیتا، جو اس کی تنخواہ تھی۔

عصر کے وقت عامر اکثر ٹہلنے نکل جایا کرتا تھا۔ اس وقت ہوٹل میں بہت کم گاہک ہوتے تھے۔ آج بھی وہ حسب معمول ٹہلتا ہوا بازار کی طرف نکل آیا۔ یہاں خوب چہل پہل اور رونق تھی، لوگوں کی بھیڑ، گاڑیوں کا اژدہام، دکانداروں اور گاہکوں کی ملی جلی آوازیں۔

"بابوجی ... ہار لے لو بابوجی!" ایک آواز سن کر عامر رُک گیا۔ ایک اس کا ہم عمر لڑکا چنبیلی کے ہار لیے کھڑا اس کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ عامر عجیب سے احساسات کا شکار ہو گیا۔

"تم ہار کیوں بیچتے ہو؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"جی ...!" لڑکا کچھ گھبرا سا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا "پیٹ کی خاطر بابوجی! میرے والد نہیں ہیں اور ماں بیمار ہے۔ اس لیے مجھے کام کرنا پڑتا ہے!" لڑکا یہ بتاتے ہوئے اُداس سا ہو گیا "یہ ہار لے لو بابوجی! بڑی اچھی خوشبو ہے" لڑکے نے ایک ہار عامر کی طرف بڑھاتے ہوئے ملتجی انداز میں کہا۔ عامر نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور چونک گیا۔ وہ لڑکا کافی حد تک اس سے مشابہت رکھتا تھا۔

"کیا قیمت ہے؟" عامر نے سر جھٹک کر جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"صرف دو روپے بابوجی!" لڑکا اُمید بھری آواز میں بولا اور ہار مزید آگے بڑھا دیا۔

عامر نے جیب سے پیسے نکالے اور ہار لینے کے بعد لڑکے کو پانچ روپے کا نوٹ تھما کر آگے بڑھ گیا۔ پیسے نکالتے ہوئے اس کی جیب سے اسکول کارڈ بھی گرا تھا، مگر اسے پتا نہ چل سکا۔

"ارے ... ٹھہرو بابوجی!" اچانک ہار والے کی نظر نیچے کارڈ پر پڑی تو وہ چونک کر بولا اور کارڈ اٹھا کر عامر کے پیچھے دوڑا۔ اس وقت تک عامر کافی دور نکل چکا تھا۔

اچانک فضا میں گاڑی کے بریکوں کی چرچراہٹ اور ایک دلدوز چیخ ایک ساتھ گونجی۔

ہار والا لڑکا ایک تیز رفتار منی بس سے ٹکرا گیا تھا چنبیلی کے ہار بکھر گئے تھے اور تیزی سے اس کے خون سے سُرخ ہوتے جا رہے تھے ...!!

مانو نے گھبرا کر تیزی سے مڑ کے دیکھا۔ اس کی جان نکل گئی۔
ایک کُتا اس پر جھپٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔

وہ تیزی سے بھاگی اور پلک جھپکتے میں سامنے والی دیوار پر چڑھتی چلی گئی۔ وہاں سے وہ ایک گھر کے صحن میں کود گئی۔
صحن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار پائیاں بچھی تھیں۔ جن میں سے ایک پر ایک بوڑھا شخص عینک لگائے بیٹھا تھا اور روٹی کے ایک ٹکڑے کو انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی مدد سے چھوٹا چھوٹا کر کے کچھ دور زمین پر پھینک رہا تھا جہاں چند مرغیاں موجود تھیں اور تیزی سے روٹی کے یہ ریزے نگل رہی تھیں۔

ابھی مانو اتنا ہی دیکھ پائی تھی کہ یکایک ایک بار پھر اسے راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ہاتھ میں ڈنڈا لیے "ہُش ہُش" کرتا ہوا تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ مانو پھُرتی سے دیوار پر جا چڑھی اور چھتوں پر چلتی ہوئی کافی دُور نکل گئی۔ ایک گھر کی چھت پر کچھ دیر رُک کر وہ نیچے صحن میں جھانکتی رہی، پھر مطمئن ہو کر نیچے چلی آئی اور "میاؤں میاؤں" کرنے لگی۔ اس کی آواز سُن کر اندر کمرے سے ایک ادھیڑ عمر عورت نکلی۔

"کیا بھوکی ہو؟" عورت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں مانو بدستور میاؤں میاؤں کرتی رہی۔ عورت نے سر ہلایا اور کمرے کے برابر ہی بنے ہوئے باورچی خانے سے روٹی اور سالن لے آئی۔ روٹی کو ٹکڑے کر کے اس نے سالن کی پلیٹ میں ڈال دیا۔ اور پلیٹ مانو کے آگے رکھ دی۔ مانو کچھ دیر اپنی جگہ کھڑی پلیٹ کو دیکھتی رہی، پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھی اور پلیٹ میں منہ مارنے لگی۔ عورت اُسے کھاتے دیکھ کر مُسکرائی اور سر ہلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

یوں مانو اس گھر میں رہنے لگی۔

یہ گھرانہ صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک وہ ادھیڑ عمر عورت، ایک بوڑھا شخص اور ایک چھوٹی سی گڑیا سی لڑکی۔ مانو مطمئن سی ہو کر ان مہربان لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرنے لگی۔

"آؤ! میں تمھیں آج کی خبریں سناؤں" حسبِ معمول چھوٹی سی شرارتی پنکی اخبار پکڑے، مانو کے پاس آکر بیٹھ گئی وہ روزانہ صبح ناشتے کے بعد مانو کو گود میں بٹھالیتی اور اخبار کی وہ خبریں اسے سناتی: جو جانوروں کے متعلق ہوتیں۔

"سنو!... لکھا ہے کہ جاپان میں ایک شخص نے اپنے بندر کو بالکل بیٹے کی طرح پالا پوسا ہے اور اس کی خدمت کے لیے ایک ملازم بھی رکھا ہُوا ہے۔ ہے نا' حیرت کی بات!... یہ دیکھو' اس بندر کی تصویر بھی چھپی ہے" پنکی نے مانو کے سامنے اخبار پھیلاتے ہوئے کہا۔ مانو نے "میاؤں" کہتے ہوئے بے نیازی سے نظریں اُٹھا کر اخبار کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر وہ کاہلی سے اخبار کو دیکھتی رہی، پھر یکایک چونک کر اپنی جگہ سے اُٹھی اور اخبار پر جُھک سی گئی۔

"کیا ہُوا!... کیا بات ہے؟" پنکی اسے اخبار سے اُٹھاتی ہوئی پریشانی سے بولی۔ مانو جس جگہ اخبار پر جُھکی تھی وہاں عامر کی تصویر نظر آرہی تھی۔ جس میں وہ بڑے معصومانہ انداز میں مُسکرا رہا تھا۔

یکایک مانو نے زور لگایا اور جست مار کر پنکی کی گود سے جا نکلی۔

"ارے ارے!... سنو۔ کہاں جا رہی ہو؟" پنکی بوکھلا کر اس کے پیچھے دوڑی، مگر مالتو اس وقت تک بہت دور نکل چکی تھی

"چھوٹو...!" استاد کی آواز آئی۔ عامر نے مڑ کر دیکھا۔ اُستاد ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنے پاس بُلا رہا تھا۔ عامر آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ تیری تصویر ہے؟" اُستاد نے اخبار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ عامر نے اخبار پر نظریں دوڑائیں۔ اس کا دِل دَھک سے رہ گیا۔ واقعی وہ اس کی تصویر تھی۔ اس کا ہاتھ تیزی سے جیب میں رینگ گیا۔ کارڈ وہاں سے غائب تھا۔

"جی ہاں استاد جی! یہ میری ہی تصویر ہے، مگر یہ خبر میرے متعلق نہیں ہے۔ یہ کسی اور لڑکے کا انتقال ہُوا ہے، میرا نہیں!" عامر نے بھولپن سے کہا۔

"وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تیرا انتقال نہیں ہُوا، جب ہی تو تُو میرے سامنے کھڑا ہے۔ مگر یہ تصویر کس طرح چھپ گئی؟" استاد مونچھوں کو مروڑتا ہُوا بولا۔

"دراصل کل جب میں بازار گیا تو وہاں کہیں میرا اسکول کارڈ گر گیا۔ بے خیالی میں مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ہو سکتا ہے، وہ کارڈ اس لڑکے کے ہاتھ لگ گیا ہو، جو ایکسیڈنٹ میں مارا گیا ہے" عامر نے وضاحت کی۔

"بات دِل کو نہیں لگی۔ تُو لڑکا کچھ گڑبڑ لگتا ہے۔ اَبے ایسا نہ ہو، کہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی گھپلا ہو، تُو یہاں سے چلا جا۔ میں تجھ جیسے لڑکے کو نہیں رکھ سکتا، جو زندہ بھی ہو اور مُردہ بھی!" استاد ہاتھ جھٹکتے ہوئے یوں بولا، جیسے عامر کو دھکے دے رہا ہو۔

"مگر اُستاد جی! میں...؟"

"اَبے کہہ دیا نا، میں تجھے نہیں رکھ سکتا۔ چل یہ لے، اپنا حساب اور پھوٹ یہاں سے" استاد نے گلّے سے کچھ نوٹ گن کر نکالتے ہوئے عامر کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ اسی دوران میں چھوٹے بھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ عامر نے ایک نظر اُسے دیکھا اور اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو آستین سے صاف کرتا ہوا تیزی سے چل پڑا۔

"عامر!" چھوٹے کی آواز سُن کر عامر کے قدم رُک گئے۔ چھوٹے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"عامر!... تم جا رہے ہو؟" چھوٹے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے غمناک آواز میں کہا۔

"بس راجو بھائی! یہاں سے دل بھر گیا ہے۔ اب کہیں اور جاؤں گا" عامر کی آواز بھرّا گئی۔

"کیسی باتیں کرتے ہو عامر! اگر استاد تمھیں نہیں رکھنا چاہتا تو کوئی بات نہیں۔ میں تمھیں کسی اور جگہ کام دِلوا دوں گا" راجو نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

"نہیں راجو بھائی! مجھے جانے دو۔ میں اب یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں یہاں سے کہیں دُور جانا چاہتا ہوں!" عامر

اُداسی سے بولا۔ اور اس سے ہاتھ ملا کر ہوٹل سے نکل آیا۔ راجو اُسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

مانو دیوانہ وار اس راستے پر آگے بڑھتی جا رہی تھی، جس پر چل کر وہ اس بستی میں آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں بجلیاں سی بھر گئی ہوں۔

یکایک وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور مارے خوشی کے وہ جھوم سی گئی۔

اس سے کچھ آگے عامر سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔!

مانو بے تابانہ انداز میں "میاؤں میاں" کرتی ہوئی لپکی اور عامر کے پیروں میں لوٹنے لگی۔

عامر چونک گیا۔

اس نے جھک کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ اُس کے منہ سے مارے خوشی کے چیخ سی نکل گئی۔ وہ تیزی سے زمین پر بیٹھ گیا اور مانو کو بڑی محبت اور چاہت سے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اس کی نرم جلد کو اپنے رخسار سے رگڑنے لگا۔ جب اس نے جی بھر کے مانو کو پیار کر لیا تو اُسے گود میں اُٹھا کر آگے چل پڑا۔ اس کے ذہن میں کسی منزل کا تصور نہیں تھا۔ بس وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بغیر کسی ارادے اور سوچ کے!

"دیمی ... میرا دیمی!" یکایک ایک بوڑھی عورت عامر کی طرف لپکتے ہوئے بولی۔ اس کی حالت کافی خراب تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے میلے ہو رہے تھے اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"جی ... میں ... میں ...!" عامر بوکھلا کر اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر سکا۔ بوڑھی عورت اُسے گلے لگا کر بے اختیارانہ انداز میں چومتی جا رہی تھی۔

"تو کہاں چلا گیا تھا، دیمی!... لوگ مجھ سے کہتے رہے کہ دیمی مر گیا ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ میرا دیمی زندہ ہے!" بوڑھی عورت بدستور اُسے گلے سے لگائے ہوئے بولی۔ عامر خاموش رہ گیا۔ اس کے ذہن میں اخبار کی وہ تصویر گھوم گئی جو اس کی تھی۔ مگر وہ موت کی خبر اس کی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ موت کی وہ خبر اس بوڑھی عورت کے بیٹے کی تھی۔ جس کی شکل اس سے ملتی جلتی تھی۔ اور اسی لیے وہ عورت اُسے اپنا بیٹا سمجھ رہی تھی۔

عامر نے فوری طور پر ایک فیصلہ کر لیا۔

"ہاں ماں جی! لوگ واقعی غلط کہہ رہے تھے۔ میں زندہ تھا۔ کھو گیا تھا۔ ماں ... میری ماں!" عامر ننھے بچّے کی طرح ہمک کر بوڑھی عورت کے گلے لگ گیا۔ بوڑھی عورت نے اُسے محبّت سے بھینچ لیا۔ ممتا بھری آغوش میسّر آتے ہی عامر کو یوں لگا جیسے اُسے اپنی گمشدہ جنّت مل گئی ہو...!

خوشگوار سفر کی نئی بات ... زیادہ آرام اور آسائش کے ساتھ!
پی آئی اے کی ایگزیکیٹو کلاس "سوہنی"!

پنے نام کی طرح حسین

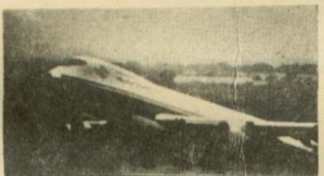

ونی ایک لفظ جو ذہن میں حسن و دلکشی کا تصور پیدا کرتا ہے .... ایک خوبصورت لفظ جو پی آئی اے کی
ز یکیٹو کلاس کے تخلیق کا محرک بنا... جس نے ہمیں آج کے کاروباری سفر کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور
سکون بنانیکی دعوت دی' اور پھر ہم نے "سوہنی" کو حسن و دلکشی، سکون و آرام کے ہمہ گیر لوازمات سے سجایا۔
۔ آپ کی سہولت کیلئے فرسٹ کلاس چیک ان کاؤنٹر، بورڈنگ میں ترجیح اور ۳۰ کلو سامان لیجانیکی اجازت
۔ آپ کے آرام و سکون کیلئے ہمارے بوئنگ ۷۴۷، طیاروں میں خصوصی کیبن، ہر قطار میں صرف ۲+۲ کشادہ
ٹیں، پاؤں پھیلانے کیلئے وافر جگہ اور خصوصی ڈیزائن کے آرام دہ "فٹ ریسٹ" .... پرسکون ماحول' جہاں
ں ہو تو دفتری کام کیجئے، یا مکمل آرام ــــ آپ کے پسندیدہ روایتی پاکستانی اور مغربی کھانے نفیس
ی برتن، دیدہ زیب کٹلری۔ خصوصی تربیت یافتہ فضائی عملہ ایک نئے اور جاذبِ نظر لباس میں ملبوس
ں کے علاوہ بہترین نئی فلمیں، مختلف قسموں کی موسیقی کے ۱۲ چینل، دنیا کے مشہور ترین اخبارات،
الے اور جرائد .... غرضیکہ وہ تمام خصوصیات جو آپ کے سفر کو داستانوں کی طرح
ین اور یادوں کی طرح دل نشیں بنادے گی۔

PIA پی آئی اے
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

سعودی عرب اور اسکینڈی نیویا کی پروازوں کے علاوہ بی ۷۴۷، کی تمام پروازوں پر۔

PID(ISLAMABAD) IAL-IPP-17-8

(آخری قسط)

پناہ

حنیف، یاسمین اور ناہید بہن بھائی تھے۔ ان کے ابو رشید صاحب فوج میں میجر تھے اور وہ لوگ سرحد کے قریب ایک قصبے میں رہتے تھے۔ تینوں امی سے اجازت لے کر سیر کے لیے باہر گئے، اِدھر دُشمن فوجیوں نے قصبے پر حملہ کر دیا اور ان کے امی ابو کو قیدی بنا کر لے گئے۔ ان کے ابو کے ایک کیپٹن دوست نے تینوں کو ان کے رشتے کے چچا چچی کے پاس بھجوا دیا لیکن چچا چچی ان کا خیال رکھنے کے بجائے ان کے ساتھ نوکروں کا سا سلوک کرتے اور مارتے پیٹتے۔ وہیں ان کی ملاقات علی سے ہوئی وہ بھی ان کی طرح اپنے خالو کے ظلم کا شکار تھا۔ ایک دن چاروں نے پروگرام بنایا کہ وہ پہاڑی کے اُس پار جزیرے میں رہنے جائیں گے۔

یہ فیصلہ کرکے وہ ایک دن جزیرہ دیکھنے گئے۔ جزیرہ دیکھ کر چاروں بہت خوش ہوئے اور یہ اندازہ لگا کر واپس آگئے کہ وہاں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ واپس آکر چاروں مختلف چیزیں جمع کرتے رہے اور ایک دن موقع پاکر سارے سامان سمیت علی کی کشتی میں جزیرے جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے مل کر ایک گھر بنایا۔ کچھ دن وہاں رہنے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ خوراک کا ذخیرہ زیادہ دن تک نہیں چل سکتا۔ لہٰذا علی گاؤں جاکر کھانے پینے کی بہت سی چیزوں کے علاوہ مُرغیاں اور گائے ریشم بھی لے آیا۔ اس طرح جزیرے میں ان کی زندگی مزید آسان ہوگئی۔ ایک دن جزیرے کی طرف ایک کشتی آتے دیکھ کر چاروں خوف زدہ ہوگئے۔ اب آپ آگے پڑھیے

علی کی بات سُن کر تینوں کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو"۔ حنیف بولا "شاید یہ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں"۔

"گھبراؤ نہیں۔ یہ ہماری تلاش میں نہیں نکلے"۔ کچھ دیر بعد علی کی مطمئن آواز آئی۔

"کیا مطلب!... تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" حنیف نے علی کو دیکھا۔

"کیا تمھیں ان کی کشتی میں سے ریڈیو کی آواز نہیں آ رہی؟" علی نے پوچھا۔

"ہاں، آ تو رہی ہے"۔ حنیف کان لگا کر سنتا ہوا بولا۔

"تو بس یہ لوگ شاید برابر والے گاؤں میں رہتے ہیں اور تفریح کرنے نکلے ہیں"۔ علی نے بڑے یقین سے کہا، اور اس کی بات درست ثابت ہوئی، کیونکہ کشتی ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس چلی گئی تھی۔ کشتی کو واپس جاتے دیکھ کر ان چاروں کی جان میں جان آئی۔

پھر ایک شام انھوں نے ایک نیا چاند دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی جھیل کے برابر والے گاؤں سے سائرن کی آواز ہوا کے دوش پر ان کے کانوں تک پہنچی تو علی بول اُٹھا "یہ رمضان کا چاند ہے اور ہمیں روزے رکھنے چاہئیں"۔

"ہاں بالکل رکھیں گے"۔ حنیف جوش سے بولا۔

"یہ پہلا رمضان اور عید ہوگی جو ہم امّی ابّو کے بغیر منائیں گے"۔ یاسمین اُداسی سے بولی۔

"جب عید آتی تھی تو ابّو ہمارے لیے اچھے اچھے تحائف اور کھلونے خریدتے تھے اور امّی مزے مزے کے کھانے پکاتی تھیں"۔ ناہید بھی اُداس ہو گئی۔

ان کی باتیں سُن کر علی کا دل بھر آیا۔ وہ سوچنے لگا "ان لوگوں نے تو اچھے دن دیکھ رکھے ہیں۔ ان کے امّی ابّو کی جگہ اب میں ان کا بڑا ہوں۔ لہٰذا میرے لیے ضروری ہے کہ ان کے لیے تحائف خریدوں"۔ اس نے دل میں پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ شہر ضرور جائے گا اور ان کے تحفے ضرور لائے گا۔

رمضان کے شروع ہوتے ہی ان کے معمولات بھی بدل گئے۔ اب وہ گاؤں کی مسجد کے سائرن کی آواز سُن کر روزہ کھولتے اور سحری کھاتے۔ چاروں بچّے بڑے شوق سے روزے رکھ رہے تھے۔

ایک صبح بڑی چمکیلی تھی۔ علی نے سوچا کہ اب اسے شہر جانا چاہیئے۔ عید بھی قریب آتی جا رہی ہے۔ اس نے کشتی نکال کر پانی میں ڈال دی اور ان کے پوچھنے سے پہلے ہی بول اُٹھا "کافی دنوں سے کشتی نہیں چلائی۔ آج کہیں باہر جانے کا ارادہ ہے۔ تم لوگوں کے لیے کچھ تحفے بھی لاؤں گا"۔ یہ کہہ کر وہ کشتی کھیتا ہوا دور نکل گیا۔ تینوں بچّوں کو وہ جب تک نظر آتا رہا، وہ ہاتھ ہلاتے رہے۔ یہاں تک کہ علی کی کشتی ایک نقطے میں تبدیل ہو کر معدوم ہو گئی۔

گاؤں پہنچ کر علی نے کشتی درختوں میں چھپائی اور گاؤں جاکر بسوں کے اڈّے پر کھڑی ایک بس میں بیٹھ گیا۔ فرّاٹے بھرتی بس نے اسے چند ہی گھنٹوں میں شہر پہنچا دیا۔ اُسے بھروسہ تھا کہ یہاں اُسے کوئی نہیں پہچانے گا۔ ایک کھلونوں کی دُکان نظر آتے ہی وہ اس میں گھس گیا۔ اس کی جیب میں کافی رقم تھی۔ جو اُس نے جزیرے کے پھل گاؤں کی منڈی میں بیچ کر حاصل کی تھی۔ اس نے یاسمین کے لیے گڑیا، ناہید کے لیے پرس اور حنیف کے لیے لکڑی سے سامان بنانے کی ترکیبوں والی کتاب خریدی۔ تحفے خرید کر وہ دکاندار سے باقی پیسے واپس لے رہا تھا کہ ایک خاتون اور مرد اس کے برابر آکر کھڑے ہوگئے۔ عورت نے ساڑھی پہن رکھی تھی جبکہ مرد کوٹ پتلون میں ملبوس تھا۔ عورت کے ہاتھ میں وہی گڑیا تھی، جو علی یاسمین کے لیے پسند کر چکا تھا۔ عورت کہہ رہی تھی: "آپ کو۔۔۔یاد ہے، یہ گڑیا یاسمین کو کتنی پسند تھی۔۔۔ نہ جانے میرے بچے کس حال میں ہوں گے۔ اللہ انھیں ہم سے ملادے" عورت نے سرد آہ بھرتے ہوئے دُعا مانگی اور دکاندار سے مختلف کھلونے پیک کروانے لگی۔

علی ان کی گفتگو سُن کر چونک گیا تھا۔ اس نے بغور ان کی طرف دیکھا تو اُسے یوں لگا، جیسے وہ حنیف، ناہید اور یاسمین کے والدین ہوں۔ اتنے میں وہ لوگ دکان سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھنے لگے۔ یہ دیکھ کر علی تیزی سے ان کی طرف لپکا اور مرد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا: "آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ حنیف، یاسمین اور ناہید کی تو بات نہیں کر رہے؟" علی کی یہ بات سُن کر وہ لوگ چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

"ہاں۔۔۔ کیا تم انھیں جانتے ہو؟" عورت مسرت بھرے لہجے میں بولی۔

اس سے پہلے کہ علی کوئی جواب دیتا، وہ آدمی جلدی سے بولا: "میرا خیال ہے کہ ہمیں ہوٹل جاکر اطمینان سے بات کرنی چاہیئے۔" وہ لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ علی نے مختصراً انھیں تمام کہانی سُنائی۔ جب وہ تمام واقعات سُنا چکا تو میجر رشید اور ان کی بیگم نے اُسے پیار کیا "ہمیں فوراً چل دینا چاہیئے۔ بچّے علی کے نہ ہونے سے پریشان ہورہے ہوں گے۔" بیگم رشید بولیں۔

ہوٹل سے وہ ٹیکسی کے ذریعے ساحل پر پہنچے اور ایک لانچ کرائے پر لے کر جزیرے کی طرف روانہ ہوگئے۔

اِدھر تینوں بچّے بے حد پریشان تھے۔ روزہ کھُلنے کا وقت ہو رہا تھا، مگر علی کا کچھ پتا نہ تھا۔ اچانک انھیں کسی لانچ کے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ بھاگ کر ساحل پر آئے۔

"ضرور علی پکڑا گیا ہے اور یہ لوگ اب ہمیں بھی پکڑنے آرہے ہیں" لانچ کو دیکھ کر حنیف خوفزدہ انداز میں بولا۔

یہ سُن کر بچّوں کا دل بیٹھ گیا مگر اسی لمحے ان کے کانوں سے علی کی خوشی بھری آواز ٹکرائی "پریشان نہ ہونا حنیف! میں تم

لوگوں کے لیے عید کا تحفہ لا رہا ہوں۔"

آخر لانچ قریب آئی تو سارا ماحول "امّی... ابّو... امّی... ابّو" کی آواز سے گونج اُٹھا۔ میجر صاحب اور ان کی بیگم ساحل پر اُترے تو تینوں بچّے دوڑ کر اُن سے لپٹ گئے، سب خوشی کے مارے کبھی رو رہے تھے، کبھی ہنس رہے تھے۔ علی ایک جانب کھڑا اُن کی خوشیاں دیکھ رہا تھا۔ حنیف نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیے۔

"علی!... میرے دوست۔ میرے بھائی! یہ خوشیاں تمھاری ہی دی ہوئی ہیں۔ اب الگ کیوں ہو گئے ہو۔ تم نے ہمارا غم بانٹا۔ اب کیا خوشیوں میں ہمارا ساتھ نہیں دوگے؟" حنیف محبّت بھرے انداز میں بولا۔ تو علی بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ روزہ کب کا کھل چکا تھا، مگر کسی کو دھیان نہیں تھا۔ آخر میجر صاحب کو خیال آیا۔ اس نے اِن کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ سب علی کی معیّت میں غار کی جانب آئے۔ انھوں نے جلدی جلدی دودھ کے ایک ایک گلاس سے روزہ کھولا۔ اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ ان کی امّی حیران تھیں کہ ناہید نے کس سلیقے سے کھانا پکایا ہے۔

کھانے کے بعد وہ سب آپس میں دیر تک باتیں کرتے کرتے نیند کی وادیوں میں جا پہنچے۔

سحری کے وقت سب سے پہلے میجر صاحب کی آنکھ کھلی۔ انھوں نے لالٹین کی مدّھم روشنی میں دیکھا۔ تمام بچّے ان کے پاس سو رہے تھے۔ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور سب بچّوں کو جگا دیا۔ ناہید اور امّی جان نے سحری کا انتظام کیا اور سب نے روزہ رکھا۔

عید میں ابھی کچھ دن باقی تھے، مگر بچّوں کو یوں لگ رہا تھا، جیسے عید آج ہی ہے۔ سحری کے بعد وہ باتیں کرتے رہے۔ جب سورج نکل آیا تو غار سے باہر آکر آس پاس گھومنے لگے۔

"اب ہمیں چلنا چاہیئے۔" اچانک میجر صاحب بولے تو سب بچّے انھیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

"مگر کہاں ابّو؟"

"بھئی اب ہم شہر چلیں گے اور عید کی تیاری کریں گے۔" میجر صاحب نے کہا۔

"نہیں ابّو! ہم اپنے پیارے جزیرے کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" بچّے ایک ساتھ بول اُٹھے۔

"بچّو! اب تمھیں یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تمھارا اپنا گھر ہوگا۔ ویسے بھی تم یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتے۔ تمھیں پڑھنا لکھنا ہے۔ اسکول جانا ہے۔" میجر صاحب نے سمجھایا۔

"پھر ابّو! ہماری ایک شرط ہے کہ ہم اپنی چھٹیاں اس جزیرے میں گزاریں گے۔" حنیف بولا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔" میجر صاحب فوراً رضامند ہو گئے اور بچّے واپس جانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ باقی سامان تو لانچ میں آ گیا، مگر ریشم گائے کی گنجائش پیدا نہ ہو سکی۔ میجر صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ بعد میں اسٹیمر کے ذریعے

اُسے لے جایا جائے۔

جزیرے سے جاتے وقت چاروں بچّوں کو بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ میجر صاحب نے لانچ اسٹارٹ کی، بچے جزیرے کی جانب دیکھ کر چلاّ اُٹھے "خُدا حافظ ہمارے پیارے جزیرے! ہم پھر آئیں گے۔"

لانچ آہستہ آہستہ جزیرے سے دُور ہوتی چلی گئی۔

چاروں بچّے اپنے نئے مکان میں ہنسی خوشی رہنے لگے تھے۔ علی بھی میجر صاحب اور اُن کی بیگم کو امّی ابّو کہنے لگا تھا۔ بیسیوں لوگ ان کو مبارک باد دینے آئے تھے۔

چاند رات کو علی نے اپنے خریدے ہوئے تحفے انھیں دیے۔ تینوں کو وہ تحفے بہت پسند آئے۔ اتنے میں میجر صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے "بچّو! میں نے سوچا ہے کہ ہم عید کہیں اور جا کر منائیں۔"

"جی ہاں ابّو جان! ہم نے بھی یہی سوچا ہے۔" بچّے بیک زبان بولے۔

"اچھا... اور جگہ کون سی سوچی ہے؟" میجر صاحب مسکرا کر بولے۔

"جزیرہ!" بچّے کورس میں چیخے۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میجر صاحب ہنسنے لگے۔

"ابّو جان.... زندہ باد!" بچّے ایک دم چلاّ اُٹھے۔

رات کو وہ سونے کے لیے لیٹے تو سپنوں میں اپنے پیارے جزیرے جا پہنچے۔ جہاں جزیرے نے انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے اپنا خوبصورت ساحل ان کے قدموں تلے بچھا دیا تھا۔

تھپّڑ بازی کا مقابلہ

۱۹۳۱ء میں روس کے شہر کیو میں طویل تھپڑ بازی کا ایک مقابلہ ہوا تھا۔ جس میں ویزلی بارڈی اور گوئینج اوّل انعام کے مستحق قرار دیئے گئے۔ یہ دونوں نوجوان مسلسل اکتّیس گھنٹے تک ایک دوسرے کے مُنہ پر تھپّڑ مارتے رہے۔

دانتوں کی طاقت کا حیرت انگیز مظاہرہ

اپریل ۱۹۷۶ء میں لانگ آئی لینڈ (امریکہ) میں بلجیئم کے رہنے والے "میتس" نامی ایک شخص نے اپنے دانتوں کی طاقت کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ اس نے ریل کے دو ڈبّوں کو ایک مضبوط رسّی کی مدد سے اپنے دانتوں کی طاقت استعمال کرتے ہوئے کھینچ کر دکھایا۔

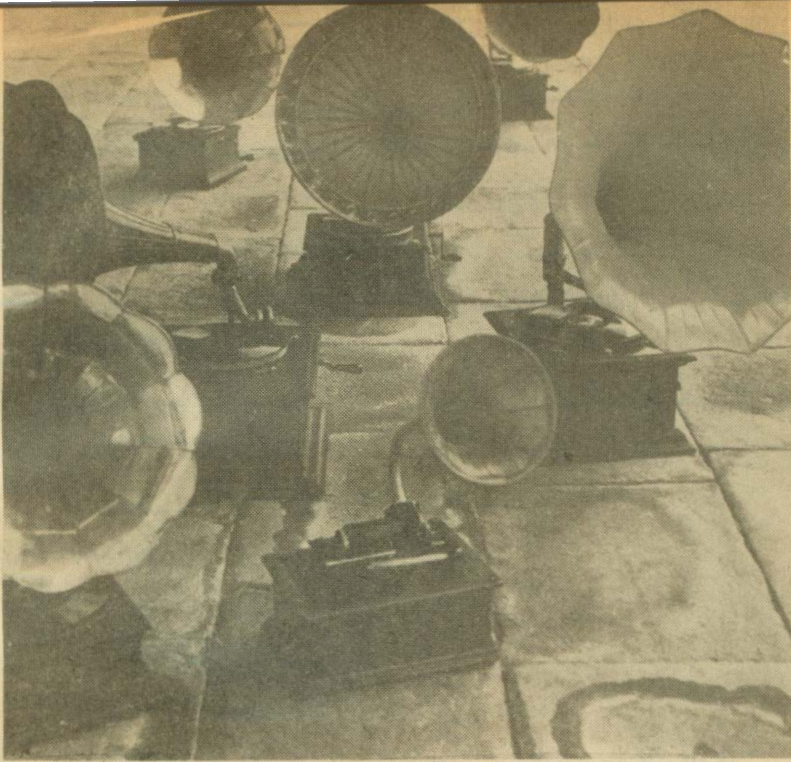

مشاغل کی کہانی

شوق کا کوئی مول نہیں

عقیل عبّاس جعفری

مشاغل کی کہانی کے سلسلہ میں اب تک ہم نے آپ کو مختلف قسم کے مشاغل کے بارے میں فرداً فرداً... تفصیلات بہم پہنچائیں۔ اس مرتبہ ہم آپ کو کچھ ایسے مشاغل کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں جو اگرچہ بہت زیادہ عام نہیں ہیں مگر پھر بھی دنیا کے متعدد افراد ان سے وابستہ ہیں۔ اور ان کے ذخیروں کی قیمت لاکھوں تک پہنچتی ہے ان مشاغل میں سے بیشتر مشاغل ایسے ہیں جو اگرچہ ساتھیوں کے لیے قابلِ عمل نہیں ہیں مگر ہم ان کی معلومات میں اضافے کے لیے ان کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

گراموفون ریکارڈ جمع کرنا:۔ اس مشغلہ کا آغاز گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں ہوا۔ ان دنوں ٹیپ ریکارڈر کی ایجاد سے گراموفون ریکارڈز کے شائقین کی تعداد اگرچہ خاصی کم ہوگئی ہے تاہم ختم نہیں ہوئی۔ اب بھی دنیا میں ایسے متعدد افراد موجود ہیں جو یہ ریکارڈز اور ریکارڈ پلیئر جمع کرنے کے شوقین ہیں۔

امریکہ کے ایک باشندے کے پاس تقریباً سات ہزار گراموفون ریکارڈز اور تین سو کے لگ بھگ فونوگراف رریکارڈ پلیئرا موجود ہیں۔

گراموفون ریکارڈز جمع کرنے کے شائقین یہ ریکارڈز موسیقار، آرکسٹرا، گلوکار یا مختلف ساز بجانے والوں کے حوالے سے جمع کرتے ہیں۔

گراموفون ریکارڈز جمع کرنے کے شائقین کو چاہیئے کہ جیسے ہی انھیں کوئی نایاب ریکارڈ ملے، اسے کسی آڈیو کیسٹ پر محفوظ کرلیں تاکہ آگر آئندہ استعمال سے ریکارڈ کو کوئی نقصان پہنچے تو کم از کم اس کی آواز تو صحیح طرح سے محفوظ رہ سکے۔ شہر کراچی میں بھی لطف اللہ نام کے ایک صاحب ہیں جن کی نجی لائبریری میں ہزاروں آوازیں محفوظ ہیں۔ ان میں شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، خطیبوں، گلوکاروں کی آوازیں شامل ہیں۔ پاکستان کے نامور شاعر فیض احمد فیض کا سارا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام ان کی اپنی آواز میں اس لائبریری میں محفوظ ہے۔ پاکستان و ہند میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد اور نادر لائبریری ہے۔

فاؤنٹین پین جمع کرنا:۔ فاؤنٹین پین جمع کرنا بھی تقریباً ایک صدی پرانا مشغلہ ہے۔ اس مشغلے کے شائقین میں سب سے بڑا نام لندن کے فلپ پول کا ہے جس کے پاس دنیا بھر کے فاؤنٹین پینوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اور لندن میں اس کی دکان "His Nibs" دنیا بھر کے فاؤنٹین پینوں کی سب سے بڑی دکان ہے۔

۱۹۴۵ء کے لگ بھگ جب بال پوائنٹ ایجاد ہوا تو ابتدا میں اُسے خاطر خواہ توجّہ نصیب نہیں ہوئی۔ مگر بعد میں شائقین نے انھیں بھی جمع کرنا شروع کیا اور اب دنیا میں بال پوائنٹ پین جمع کرنے کے بھی ہزاروں شائقین موجود ہیں۔ جن کی سب سے بڑی تعداد جاپان میں ہے۔

سگریٹ لائٹرز جمع کرنا:۔ فاؤنٹن پین اور بال پوائنٹ پین جمع کرنے والوں کی طرح سگریٹ لائٹرز جمع کرنے کے سب سے زیادہ شائقین بھی جاپان ہی میں بستے ہیں۔

سگریٹ لائٹرز میں پتھر سے جلنے والے لائٹرز زیادہ قیمتی سمجھے جاتے ہیں، مگر پٹرول اور گیس سے چلنے والے لائٹرز بھی کسی سے کم نہیں۔

تاہم آج کل ایسے لائٹرز کا استعمال عام ہوگیا ہے جو استعمال کے بعد بے کار ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں پھینک دیا جاتا ہے۔ ایسے لائٹرز سستے ہونے کے باعث تشہیری مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ سگریٹ لائٹرز جمع کرنے والے افراد ایسے لائٹرز بھی جمع کرنا پسند کرتے ہیں۔

چھڑیاں :- کین کی بنی ہوئی خوبصورت چھڑیاں جمع کرنا کئی صدی پرانا مشغلہ ہے۔ اٹھارہویں صدی سے اس صدی کی چوتھی دہائی تک یورپ بالخصوص انگلستان اور فرانس کے ہر معزز شہری کا اپنے ہمراہ خوبصورت چھڑیاں رکھنا فیشن سمجھا جاتا تھا۔ موٹر کاروں کی ایجاد کے بعد چھڑیوں کا استعمال آہستہ آہستہ متروک ہوگیا۔ کیوں کہ کاروں میں اپنے ساتھ چھڑی رکھنا خاصا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ان دنوں چھڑیاں استعمال توکم ہوتی ہیں۔ البتہ انھیں جمع کرنے کے شائقین اپنے ذخیرے میں طرح طرح کی چھڑیاں جمع کرنا زیادہ باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔

ان چھڑیوں کی قیمت کا تعین، لکڑی کی اقسام سے زیادہ ان کے دستے کے ڈیزائن کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ یہ دستے لکڑی، ہاتھی دانت اور مختلف دھاتوں کے بنے ہوتے ہیں اور ان پر خوبصورت اور متنوع ڈیزائن کھُدے ہوتے ہیں۔ جن چھڑیوں کے دستوں پر سونے یا چاندی کا کام ہوتا ہے وہ نسبتاً زیادہ مہنگی ہوتی ہیں۔

دستی پنکھے :- اگرچہ دُنیا کے سب سے خوبصورت دستی پنکھے جاپان میں بنتے ہیں۔ مگر صرف یورپ اور امریکہ میں دستی پنکھے جمع کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور ان کی باضابطہ انجمنیں قائم ہیں۔ جن کی باقاعدہ میٹنگز ہوتی ہیں اور خبری مراسلے شائع ہوتے ہیں۔

دستی پنکھے صرف کاغذ اور لکڑی ہی سے نہیں بنتے۔ ان کے بننے میں پرندوں کے (بالخصوص شترمُرغ) کے پَر اور ریشمی کپڑے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ کاغذ کے پنکھوں پر دیدہ زیب اور خوبصورت ڈیزائن انھیں جاذبِ نظر بناتے ہیں۔

یہ مشغلہ مردوں سے زیادہ خواتین میں مقبول ہے۔

بوتلیں :- بعض افراد شیشے کی بنی ہوئی خوب صورت بوتلیں جمع کرنے کے شائق ہوتے ہیں اور بعض محض ان کے ڈھکن جمع کرتے ہیں۔ سینٹ اور عطر کی خوبصورت شیشیاں، ایسے افراد کے ذخیرے کو خوشنما بناتی ہیں۔

کراچی کی بوتل گلی بھی خوبصورت بوتلوں کا ایک اچھا بازار ہے۔ جہاں سے لوگ خوب صورت بوتلیں خرید کر انھیں منی پلانٹ لگانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

چابیاں اور چابیوں کے چھلّے :- چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لیے تالوں اور چابیوں کی ایجاد کئی ہزار سال پرانی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ چابیاں کاریگری اور نقاشی کا خوبصورت پیکر بنتی گئیں۔ بعض چابیاں تو اتنی قیمتی ہوتی تھیں کہ وہ فرنیچر کی قیمت سے بھی زیادہ مہنگی پڑتی تھیں۔

بعض افراد چابیوں کے ساتھ ساتھ خوبصورت چھلّے (Key Chains) بھی جمع کرنے کے شائق ہوتے

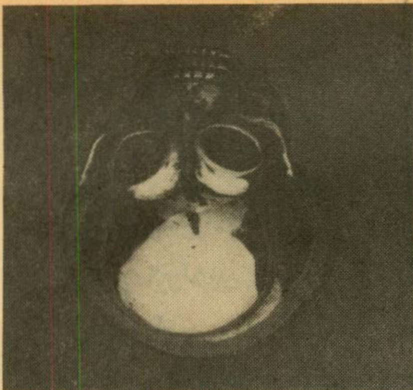

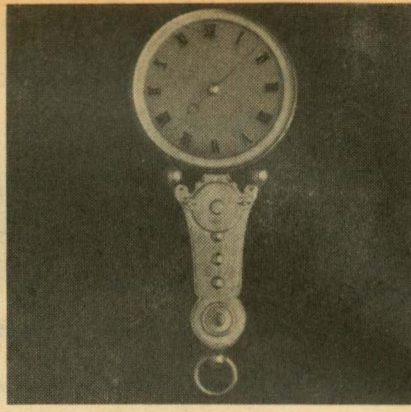

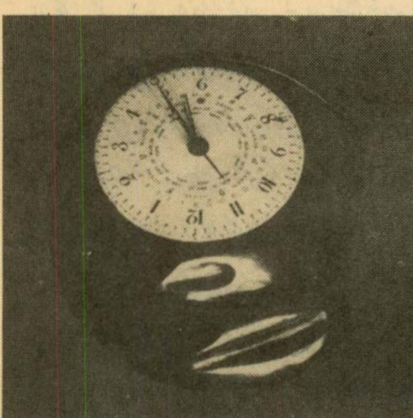

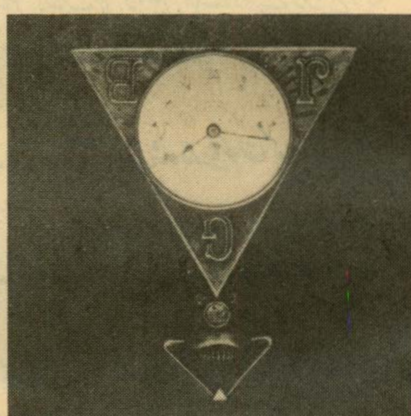

ہیں۔ مختلف ادارے اپنی تشہیر کے لیے خوبصورت چھلّے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ چھلّے جمع کرنے کے شائقین کے مجموعے میں یہ چھلّے بھی خوبصورت اضافہ ثابت ہوتے ہیں۔

گھڑیاں:۔ جیبی گھڑیاں اب سے تقریباً پانچ سو برس پہلے ایجاد ہوئیں۔ مگر اس وقت یہ اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ انھیں جیبی سے زیادہ پورٹیبل گھڑیاں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے صنعت کاروں نے گھڑیوں کو صنعتی پیمانے پر بنانے کا آغاز کیا۔ اور گھڑیوں اور ان کی چین کے لیے سونے اور چاندی جیسی دھاتیں استعمال کرنا شروع کیں۔ یہ گھڑیاں دن میں تو جیب میں رکھی جاتی تھیں اور رات کو خصوصی اسٹینڈز پر لٹکا دی جاتی تھیں۔ یہ اسٹینڈ کئی اقسام کے میٹریل سے بنتے تھے، جن میں لکڑی، چائنا، ہڈیاں اور مختلف دھاتیں شامل ہیں۔

دیواری گھڑیوں کی ایجاد بھی اگرچہ خاصی پرانی ہے مگر اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے تک یہ صرف متموّل اور امیر گھرانوں ہی میں موجود ہوا کرتے تھے ۔ آہستہ آہستہ امریکہ اور یورپ میں معیارِ زندگی بلند ہوا ۔ اور دوسری طرف ان دیواری گھڑیوں کے سادہ اور ارزاں ڈیزائن بازار میں عام ہوئے ۔ یوں یہ گھڑیاں آہستہ آہستہ ہر گھر کی زینت بن گئیں ۔

پھر شیلف پر رکھی جانے والی گھڑیاں منظرِ عام پر آئیں ۔ جو دیواری گھڑیوں کی بہ نسبت خاصی سستی تھیں ۔ یہ گھڑیاں امریکہ میں بننی شروع ہوئیں اور آہستہ آہستہ برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک تک بھی پہنچ گئیں ۔

دیواری اور جیبی گھڑیاں جمع کرنا، سکوں اور ڈاک ٹکٹوں کی طرح، دُنیا بھر کا ایک مقبول مشغلہ ہے ۔

پیپر ویٹس : یوں تو سب سے خوبصورت پیپر ویٹس شیشے کے بنے ہوتے ہوتے ہیں ۔ مگر میٹریل کے اعتبار سے ان کی اقسام کی تعداد لامحدود ہے ۔ اب لوہے، تانبے، جست، مختلف بھرتوں، لکڑی، سنگِ مرمر اور پلاسٹک کے بنے ہوئے اتنے خوبصورت اور متنوع پیپر ویٹس دستیاب ہیں کہ انھیں ایک دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے ۔ شیشے کے کچھ پیپر ویٹس ایسے بھی ملتے ہیں جن میں مختلف کیڑے مکوڑے، تتلیاں، پھول پتے اور ایسی ہی دوسری اشیاء محفوظ کر دی جاتی ہیں ۔

حالیہ تاریخ میں پیپر ویٹس کا سب سے خوبصورت ذخیرہ مصر کے سابق شاہ فاروق کا تھا، کہا جاتا ہے کہ اُن کی وجہ سے پیپر ویٹس کا شمار بھی نوادرات میں ہونے لگا تھا ۔

خود کار کھلونے :۔ بچّوں کے لیے کھلونوں کی ایجاد تو کئی صدی پُرانا قصّہ ہے مگر جدید طرز کے خود کار کھلونے بننے کی کہانی صرف ایک صدی پرانی ہے ۔

ان خود کار کھلونوں کا آغاز جرمنی سے ہُوا، اور ایک مدّت تک جرمنی کے بنے ہوئے کھلونے، دُنیا کے سب سے اچھے کھلونے کہلائے جاتے رہے، مگر دوسری جنگِ عظیم کے بعد، برطانیہ، ہانگ کانگ اور جاپان نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور وہ اس میدان پر چھا گئے ۔

خود کار کھلونوں میں سب سے زیادہ موٹر کاریں جمع کی جاتی ہیں ۔ پھر ہوائی جہاز اور ریل گاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ماڈلوں کا نمبر آتا ہے ۔ خود کار گڑیاں اور خود کار جانوروں میں بھی کھلونے جمع کرنے کے شائقین بڑی گہری دلچسپی لیتے ہیں ۔

بعض ممالک میں کھلونوں کی نہ صرف کئی کئی منزلہ دکانیں ہیں بلکہ ایسے کلب بھی موجود ہیں جو کھلونے جمع کرنے کے شائقین کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتے ہیں اور ان کے درمیان مختلف النوع مقابلوں کا انعقاد بھی کرواتے ہیں ۔

پوسٹرز :- پوسٹرز جمع کرنا ایک مشکل مشغلہ ہے۔ کیونکہ اب پوسٹرز کے موضوعات اتنے پھیل چکے ہیں کہ ہر موضوع پر پوسٹرز اکٹھے کرنا ممکن نہیں، پھر دوسرا مسئلہ انھیں محفوظ رکھنے کا ہے۔ کیونکہ اگر انھیں رول کرکے رکھا جائے تو وہ خراب ہو جاتے ہیں۔

تاہم اگر کسی ایک ہی موضوع مثلاً عالمی جنگوں، سینما، کھانے پینے کی اشیاء، تمباکو نوشی، تماشوں یا کھیلوں تک محدود ہوں تو انھیں جمع کرنا اور ان کی خرید و فروخت کرنا فائدے کا باعث بن سکتا ہے۔

پوسٹرز جمع کرنے والوں کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ یہ پوسٹرز کسی میز کی خاصی بڑی دراز میں اس طرح رکھیں کہ انھیں رول نہ کرنا پڑے۔

دیگر مشاغل :- ان خوبصورت اور متنوع اشیاء کے علاوہ بھی ایسی بہت سی اشیاء موجود ہیں جنھیں جمع کرنے کے شائقین سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان اشیاء میں، بٹن، بکّل، کارک اسکرو، جوتے، لوہے کے مختلف اوزار، دستانے، گلدان، برقی لیمپ، فلمیں، کیمرے، تاش کے پتے، بوتلوں کے لیبل، سگار کے ڈبے، سگریٹ کے خالی پیکٹ، بس، ٹرام اور ٹرین کے ٹکٹ اور بک مارکس شامل ہیں۔ یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے

آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کیلئے

گرین گائیڈ اکیڈمی کے تحائف

راہنما کتابیں

اِن کا مطالعہ —— علم بڑھائے گا

اِن کی موجودگی —— مفید ثابت ہو گی

قرآنی حکایات کا ۱۰۴ صفحات پرمشتمل خوبصورت مجموعہ

اس کے حصول کے لئے ۱۰روپے کا منی آرڈر بھجوائیں

خاکِ وطن سے سرزمین حرم تک، معلومات بھی راہنمائی بھی

حجاج اور زائرین کے لئے نادر تحفہ ۔ ۲۰۳ صفحات

اسلام کی بنیادی معلومات جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے ۔ مولانا مفتی کفایت اللہ کی تالیف (چار حصے)

تعلیم الاسلام مفت حاصل کرنے کے لئے فی کتاب ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوائیں۔ رقم یا کم ڈاک ٹکٹ قابل قبول نہ ہوں گے

کتاب منگوانے کے لئے اِس پتے پر خط لکھیں۔

گرین گائیڈ بک سیریز گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ڈی۔ سائٹ کراچی ۱۶

نئی تحریریں

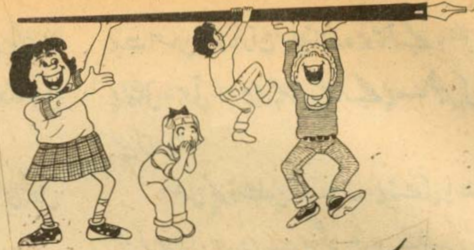

نیکی کا صلہ

شائستہ تبسم ——— کراچی

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں چھٹی جماعت کی طالبہ تھی۔ اسکول گھر سے کافی دور تھا اور مجھے اکیلے ہی جانا پڑتا تھا۔ چونکہ راستہ کافی پُررونق تھا۔ اس لیے کبھی فاصلے کی زیادتی اور اکیلے پن کا احساس نہ ہوا۔ راستے میں دو بہت چوڑی چوڑی شاہراہیں بھی پڑتی تھیں، لیکن بچپن ہی سے ان سے مانوس تھی اس لیے کبھی پریشانی نہ ہوئی۔ بچپن کا زمانہ تھا۔ کہانیوں کا شوق بھی خوب ہی تھا اس زمانے میں ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک بچّہ ایک اندھے آدمی کو سڑک پار کرا دیتا تھا اور اُس کو اس نیکی سے سچّی خوشی حاصل ہوئی تھی --- میں بھی اسی طرح کی سچّی خوشی کی تلاش میں تھی۔ اور اسکول آتے اور جاتے وقت دونوں شاہراہوں پر خوب نظر رکھتی تھی۔

ایک دن اسکول سے واپسی میں مَیں گھر کی طرف آ رہی تھی۔ جب میں بڑی سڑک کے قریب پہنچی تو مجھے پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"پیاری بیٹی! ذرا اندھے بابا کو سڑک پار کرا دو۔"

میں نے مڑ کر دیکھا ایک اندھا آدمی ایک ہاتھ میں سبز رنگ کے کپڑے کا تھیلا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کالے رنگ کی چھڑی پکڑے ہوئے تھا۔ بدحالی اس کے حلیے اور شکل سے عیاں تھی۔ جب اُس نے مجھ سے سڑک پار کروانے کی درخواست کی تو میں اس کی بات ٹال نہ سکی۔ میں نے بوڑھے آدمی کی چھڑی پکڑ کر پہلے اُسے ایک سڑک اور پھر دوسری سڑک پار کرا دی اور اُس سے کہا "لو بابا! دونوں سڑکیں پار ہو گئیں۔ اب میں چلتی ہوں، مجھے گھر جانا ہے۔"

بوڑھے نے مجھ سے کہا "بچّی میں اس علاقے میں نیا آیا ہوں اور میں اپنے ایک دوست کا پتہ معلوم کر رہا ہوں تم یہ بتاؤ کہ آس پاس کوئی کتابوں کی دکان ہے"

میں نے ذرا اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر مجھے ایک کتابوں کی دکان نظر آئی میں نے اُس سے کہا "ہاں! وہ سامنے نظر آ رہی ہے۔"

بوڑھے نے پھر مجھ سے کہا "بچّی میں تو دیکھ نہیں سکتا اللہ تمھیں اجر دے گا تم مجھے ذرا اس کے قریب پہنچا دو۔"

میں نے دل میں سوچا جب اتنی نیکی کر لی ہے تو اس کو بیچ میں نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ بوڑھے کو وہاں پہنچانے میں مشکل سے پانچ منٹ لگیں گے۔ مَیں گھر میں بتا دوں گی کہ

ایک بوڑھے اندھے آدمی کی مدد کی تھی۔ اس لیے دیر ہوگئی۔ یہ سوچ کر میں نے بوڑھے کی چھڑی پکڑی اور اس کو دکان کی طرف لے کر چل پڑی۔

راستے میں بوڑھے نے مجھ سے پوچھا "تم کس اسکول میں پڑھتی ہو۔؟"

میں نے کہا "ہاں"

اس نے پوچھا "کس کلاس میں؟"

میں نے بتایا "چھٹی کلاس میں"

وہ کہنے لگا "میرا بھی ایک بیٹا تھا۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر اس کو ایک ٹرک نے ٹکر مار دی تھی جب وہ سڑک پار کر رہا تھا۔ وہ مر گیا۔ تم ذرا دیکھ کر سڑک پار کیا کرو۔ اور بوڑھے اور اندھوں کی مدد کیا کرو۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو" مجھے بوڑھے کا قصہ سن کر اس سے شدید ہمدردی ہوئی اور میں اس بات پر خوش ہوئی کہ میں نے اس کی مدد کی۔

اتنے میں ہم دونوں کتابوں کی دکان پر پہنچ گئے۔ میں نے بوڑھے سے کہا "یہ دکان آگئی ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ"۔

بوڑھے نے مجھے آواز دے کر روکا "بیٹی تم نے اتنا میرا کام کر دیا ہے۔ مجھ غریب کی اتنی مدد کی ہے۔ مجھ پر ایک احسان اور کر دو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں اندھا ہوں اور یہاں شام تک بھٹکتا رہ جاؤں گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ یہاں کہیں آس پاس بچوں کا کوئی اسکول ہے بس مجھے اس اسکول کی پچھلی گلی میں جانا ہے۔ عظیم صاحب کا گھر پچھلی گلی میں ہے۔ بس تم مجھے وہاں تک چھوڑ آؤ۔ اللہ تمہیں اجر دے گا۔ تمہارا بہت احسان ہوگا۔ اگر آج میرا بیٹا زندہ ہوتا تو مجھے بالکل پریشانی نہ ہوتی۔ وہ میری چھڑی پکڑ کر مجھے پورے شہر کی سیر کرا دیتا"۔

اسکول کچھ فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ بوڑھے کی بات سن کر میرا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس اندھے بابا کو ضرور عظیم صاحب کے ہاں چھوڑ آؤں گی۔ پھر وہاں سے چھوٹے راستے سے ہوتی ہوئی گھر پہنچ جاؤں گی۔ پھر میں نے بوڑھے کی چھڑی پکڑی اور چل پڑی۔ اسکول کے قریب پہنچ کر ہم اس کی پچھلی گلی میں مڑ گئے۔ وہاں رش نسبتاً کم تھا۔ کیونکہ وہ پرائمری اسکول تھا اور اس کی چھٹی ہوئے کافی وقت ہو گیا تھا۔ کچھ آگے جا کر گلی میں سناٹا ہو گیا۔ میں اور اندھا آدمی چلتے رہے۔ اچانک کچھ دور جا کر ایک دم بوڑھے نے زور سے سیٹی بجائی۔ میں نے مڑ کر دیکھا گلی کے کونے پر ایک سوزوکی پک اپ کھڑی تھی۔ میں یہ دیکھ ہی رہی تھی کہ ایک دم بوڑھے نے میرے منہ پر زور سے ہاتھ رکھا مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا، میں نے زور سے چیخنا چاہا لیکن آواز حلق میں ہی دب گئی۔ میرا ذہن تیزی سے چلنے لگا۔ ساری پڑھی ہوئی کہانیاں قصے یاد آنے لگے۔ اپنی امی کے بتائے ہوئے قصے کہ کس طرح بچوں کو بے وقوف بنا کر اٹھائی گیرے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ پھر ان کے ہاتھ پیر کاٹ کر فقیر بنا دیتے ہیں۔ اور بچے ساری زندگی اپنے ماں باپ سے نہیں مل پاتے۔ یہ خیال آتے ہی کہ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے لے جائیں گے۔ میں نے اپنا تھرماس گھما کر زور سے بوڑھے کے سر پر مارا۔ اس اچانک حملے سے بوڑھے کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی میں نے زور سے بوڑھے

کے ہاتھ پر کاٹ لیا اور خوب ہاتھ پیر چلائے ایک زوردار ٹکّہ بوڑھے کے پیٹ میں پڑا۔ جیسے ہی وہ ذرا پیچھے ہوا۔ میں نے اپنا بستہ زمین پر پھینکا اور اسکول کی طرف بھاگنا شروع کر دیا میں نے بھاگتے بھاگتے مُڑ کر دیکھا۔ اندھا اور پک اپ کا ڈرائیور دونوں میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں تیزی سے اسکول والی گلی میں مُڑ گئی۔ اسکول کے قریب پہنچ کر میں نے چیخ چیخ کر چوکیدار سے کہا کہ ان دونوں آدمیوں کو پکڑو۔ یہ مجھے اغوا کر رہے تھے۔ چوکیدار سے مجھے بات کرتا دیکھ کر وہ دونوں بھاگ گئے۔ چوکیدار مجھے لے کر پرنسپل صاحبہ کے پاس گیا۔ پھر پرنسپل صاحبہ مجھے گھر تک چھوڑنے آئیں۔ اس قصّے کے بعد میں بہت دن تک اسکول نہ جا سکی۔ آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس واقعے کو سنانے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ آئندہ سے آپ لوگ کسی اندھے یا بوڑھے کی مدد نہ کریں۔ بلکہ یہ مقصد ہے کہ اگر کوئی اندھا یا بوڑھا آدمی سڑک پار کرانے کو کہے تو سڑک ضرور پار کرا دیں لیکن اگر وہ یا کوئی اور پتہ پوچھے تو اس سے کہیں کہ کسی بڑے آدمی سے پوچھے اور کبھی کسی کو گھر کا راستہ دکھانے اس کے ساتھ نہ جائیں اور ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اندھے لوگوں کے پاس ایک سفید چھڑی ہوتی ہے۔ جو ان کے اندھے پن کی پہچان ہوتی ہے۔

ہارٹ اٹیک

مرسلہ: جاوید اختر انصاری ———— اورنگی ٹاؤن کراچی

بنگو صاحب کی دو لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئی۔ ان کے بیٹوں کو تشویش ہوئی کہ ابّا دل کے مریض ہیں۔ اتنی بڑی خوشی ان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ چنانچہ انھوں نے ایک ماہرِ نفسیات کی خدمات حاصل کیں کہ وہ کسی طرح یہ خبر اُن کے والد کو سُنا دے۔ ماہرِ نفسیات نے اُن صاحب سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا "باباجی! اگر آپ کی دس ہزار روپے کی لاٹری نکل آئے تو آپ کیا کریں گے؟"

وہ صاحب بولے "میں ایک موٹر سائیکل خریدوں گا"

"اچھا اگر پچاس ہزار روپے کی لاٹری نکل آئے تو؟"

وہ صاحب بڑے حیران ہوئے آخر بولے "میں اس رقم سے اپنے بیٹوں کو بھی موٹر سائیکل دلا دُوں گا"

ماہرِ نفسیات نے بات آگے بڑھتے دیکھی تو تھوڑی دیر بعد پھر بولا "باباجی! اگر آپ کی ایک لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئے تو آپ کیا کریں گے؟"

ان صاحب کو تشویش ہوئی۔ بولے "آخر کیا بات ہے مجھے بھی تو پتا چلے؟"

"نہیں بزرگوار! میں ویسے ہی پوچھ رہا تھا اگر بالفرض ایسا ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟"

چاروناچار وہ صاحب بولے "بھئی ایسا ہو جائے تو میں ایک کار ہی خرید لوں گا۔ محفوظ ذریعۂ سفر ہے۔ اس میں چوٹ لگنے کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے"

اب ماہرِ نفسیات آخری نقطے پر پہنچا اور بولا "باباجی! اگر سچ مچ آپ کی دو لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئے تو آپ کیا کریں گے؟"

وہ صاحب جھلّا گئے اور بولے "خدا کی قسم! اگر دو لاکھ کی لاٹری نکل آئے تو ایک لاکھ روپے میں تمھیں دے دُوں گا" یہ سُننا تھا کہ ماہرِ نفسیات کو "ہارٹ اٹیک" ہو گیا۔

کشمکش

صاعقہ بانو ـــــــ کراچی

وہ سوچوں میں گھری بیٹھی تھی۔"چچا اس ہسپتال میں موجود ہیں یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ہماری زندگی میں دُکھ کے اندھیرے بکھیرنے والے یہی تو ہیں۔ انھوں نے ہی ہمیں دکھوں سے آشنا کیا۔۔۔ نہیں۔۔" اس نے ایک دم سر تھام لیا۔" میں کیا کروں، کیسے بھول جاؤں وہ سب کچھ یا اللہ مجھے صبر عطا فرما۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"ارے ڈاکٹر نیلم کن سوچوں میں گم ہیں۔۔۔" ڈاکٹر مہک کی آواز نیلم کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آں۔۔۔ کچھ نہیں" وہ چونک کر خیالات کے ہجوم سے نکل آئی۔

"جناب آپ کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے اور اب میری ڈیوٹی شروع ہو رہی ہے۔" مہک نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

"اچھا چُپ کرو۔ مجھے معلوم ہے" نیلم جھینپ گئی۔ مہک مسکرا دی۔"اچھا میں جا رہی ہوں خدا حافظ" نیلم نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تمہارا تو بس خدا ہی حافظ ہے" مہک اسے پُر تشویش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی اور ہاتھ ہلا دیا۔

نیلم گھر پہنچ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ آپا کئی مرتبہ کھانے کے بارے میں پوچھ چکی تھی مگر نیلم نے منع کر دیا۔ تنہائی میسر آتے ہی نیلم کو ایک بار پھر خیالات پریشان کرنے لگے۔ ماضی ایک ایک ورق اُلٹ کر سامنے آ گیا۔ بیتے دنوں کی یاد کسی فلم کی طرح دماغ کی اسکرین پر روشن ہو گئی۔ نیلم دسویں جماعت میں ہی تھی کہ اُس کے بہت محبت کرنے والے پاپا دُنیا سے رُوٹھ گئے اور اُس دن سے ان کی بدقسمتی کے دن شروع ہو گئے۔ پاپا کے بعد بزنس چچا جان نے سنبھال لیا۔ آمدنی میں سے بہت تھوڑی رقم وہ اپنی بھابی یعنی نیلم کی مما کو دے دیتے باقی خود ہضم کر جاتے۔ دونوں ماں بیٹی مجبور تھیں۔ کیا کر سکتی تھیں۔ چھ برس بعد نیلم کی مما نے بھی شاید دکھوں کی یلغار سے تھک کر دنیا سے منہ موڑ لیا۔ نیلم بالکل بے سہارا ہو گئی۔ ایسے وقت میں چچا کے علاوہ کوئی دروازہ نہ تھا۔ نیلم میڈیکل کے آخری سال میں تھی، چچا نے کچھ دن تو اچھا سلوک کیا اس کے بعد وہ سلوک شروع ہو گیا۔ جو بے حس لوگ بے سہاروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ جیسے تیسے کر کے اُس نے بڑی مشکلوں سے میڈیکل نیلم مکمل کی اور ہسپتال میں ملازمت کر لی۔ تمام لوگ نیلم کو۔۔۔ بے سہارا چھوڑ گئے۔ نہ چھوڑا تو اس کو بچپن سے پالنے والی جنم جنم کی ساتھی آپا نے کچھ عرصے بعد نیلم آپا کے ساتھ اپنے گھر منتقل ہو گئی اور ماضی کی یادوں کو اپنے ذہن سے کھرچ ڈالا۔ لیکن آج بھی یہ یادیں روزِ اوّل کی طرح روشن اور تابناک تھیں۔

آج ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے جب وہ ایک وارڈ کے قریب سے گزرنے لگی تو نرس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا:

"ڈاکٹر! وارڈ نمبر ۱۲ کے مریض کی حالت بہت خراب ہے"۔

اور مریض کو دیکھتے ہی زمین، آسمان اُس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سَر تھام لیا۔

دوسرے دن نیلم کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کتاب کے مطالعے میں غرق تھی کہ نرس گھبرائی ہوئی آئی اور کہنے لگی "ڈاکٹر! وارڈ نمبر ۱۲ کے مریض کی حالت سخت خراب ہے آپ جلدی سے چلیں"۔

"وارڈ نمبر ۱۲... وارڈ نمبر ۱۲..." یہ الفاظ کسی ہتھوڑے کی مانند اُس کے دماغ پر برسنے لگے "اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔ انتقام لینے کا... ہاں اُسے یوں ہی مر جانا چاہیئے"۔

"ڈاکٹر جلدی کریں" نرس نے اُسے سوچوں میں غرق دیکھ کر جھنجھوڑا۔

"میں مصروف ہوں" نیلم نے رُکھائی سے کہا "میری طبیعت خود ٹھیک نہیں ہے کسی اور سے کہو" نرس مایوس ہو کر چلی گئی۔

ایک دَم اُس کی نگاہوں میں اپنی ماں کا چہرہ گھوم گیا "بیٹا! انتقام بھول جا۔ بھلا کر بھلا ہوگا" پھر اُسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یاد آئی "طاقتور وہ نہیں جو مدِمقابل کو پچھاڑ دے"۔

"انتقام!" ایک آواز گونجی جو شاید اُس کے دل کی آواز تھی۔

"بھلا کر بھلا ہوگا... طاقتور وہ نہیں... انتقام... بھلا کر... طاقتور... انتقام"۔ تمام الفاظ اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگے۔

"میں کیا کروں" اس نے سَر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"بھلا کر... طاقتور وہ نہیں... انتقام!" انتقام کی آواز اُسے کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی "ہاں میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ماما کی بات مانوں گی" نیلم نے فیصلہ کیا اور ایک نئے جوش و جذبے کے ساتھ وارڈ نمبر ۱۲ کی طرف لپکی، جذبۂ انتقام اور حُسنِ سلوک کے درمیان جنگ میں فتح نیکی اور حسنِ سلوک کی ہوئی تھی۔

سردی آئی

سردی آئی ، سردی آئی
پہنو کمبل اور رضائی

سردی سے سب کانپ رہے ہیں
کپڑوں سے تن ڈھانپ رہے ہیں

سردی سے جو کُہر ہے چھائی
ٹھنڈی یخ یخ ہوائیں لائی

سردی کی لمبی راتوں میں
مگن ہیں اچھی باتوں میں

مُونگ پھلی چلغوزے کھاؤ
چائے کے بھی تم مزے اُڑاؤ

راہی ہر چیز گرم ہی کھانا
سَرد چیز کو مت ہاتھ لگانا

فضلِ ربی راہی، مینگورہ (سوات)

ماہنامہ
آنکھ مچولی

اچھا پڑھیے

آگے بڑھیے

آپ کی علمی ضرورت بھی ہے اور آپ کے ادبی ذوق کی تسکین بھی
اسے باقاعدگی سے پڑھنے کے لئے اور اس کے حصول کو آسان بنانے کے لئے

ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہو جایئے

اس میں مالی منفعت بھی ہے اور علمی فائدہ بھی

اسے حاصل کرنے کی ذمہ داری ہم پر ڈال دیجئے

ماہنامہ آنکھ مچولی (خصوصی بچت اسکیم) گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی، ۱۳ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

خصوصی بچت اسکیم

۱۲ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے ~~۱۲۰~~ ۹۰ روپے

۲۴ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے ~~۲۴۰~~ ۱۸۰ روپے

مالی فائدے کے علاوہ زحمت سے نجات رسالے کی بحفاظت ترسیل اور ۲ سالہ ممبرشپ پر قیمتی کتب بلا معاوضہ

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

میں ماہنامہ "آنکھ مچولی کی خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتا / چاہتی ہوں
اس کوپن کے ساتھ ۱۲/۲۴ شماروں کی قیمت مبلغ..... روپے کا بینک ڈرافٹ / پوسٹل آرڈر
منی آرڈر کی رسید منسلک ہے ـــــ میرے نام حسب ذیل پتے پر ماہ ...... سے ماہنامہ
جاری کر دیا جائے۔

نام ـــــــــــــــــــــــــــــ

مکمل پتہ ـــــــــــــــــــــــــــــ

کوئی ضروری ہدایت ـــــــــــــــــــــــــــــ

فون نمبر ـــــــــــــ دستخط ـــــــــــــ

بستی آنکھ مچولی کی

ستمبر میں ادارہ آنکھ مچولی کی جانب سے 'بستی آنکھ مچولی کی' کے عنوان سے انعامی مقابلۂ مضمون نویسی کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں ملک بھر سے ساتھیوں کے دلچسپ اور معلوماتی مضامین موصول ہوئے۔ منصفین کے فیصلے کے مطابق، عاصمہ گل پشاور کے مضمون کو پہلا، عارف الرحمٰن میٹھا خیل کو دوسرا اور فرزانہ روحی کراچی کو تیسرے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اس مقابلے میں حصہ لینے والے ساتھیوں کے نام درج ذیل ہیں۔ انعام یافتہ اور دیگر منتخب معلوماتی مضامین باری باری شائع کئے جائیں گے۔

مشتاق حسین، خیبر بازار، پشاور، محمد انیس، ڈھڈیوالہ فیصل آباد، شہین ناز، شادمان ٹاؤن، کراچی، محمد فرحان یامین نارتھ کراچی، کراچی، بصیرالدین گاہوکھٹی، طالب المولیٰ کالونی، نجیب الدین محمد، یونیورسٹی کیمپس، پشاور، شکیل احمد، جمرود خیبر ایجنسی، عقیل احمد، واہ کینٹ، محمد عنایت انجم، بھابھڑا، سرگودھا، تسلیم اختر، مغلپورہ، لاہور، ظہور احمد بلوچ، پبلک اسکول، حیدرآباد، امجد علی شاہ، ظاہر پیر خان پور، غلام مرتضٰے تیافی، وحدت کالونی، حیدرآباد، ظہور احمد بلوچ وادیٔ کلگ راسکو، خان پور، محمد نعیم خان شاکر، کالا باغ، میانوالی۔ اشتیاق احمد مغل، سکھو راولپنڈی، حبیب اللہ قمر چنگوری، واہ کینٹ، عامر اعجاز، راجہ بازار، گجرات، غلام اکبر چانڈیو، سکھر، جمیل احمد تبسم، بورا روڈ، میاں چنوں، صائقہ بانو، شادمان ٹاؤن، شرجیل حسن، پی اے ایف کالج، رسالپور، عمران حیدر، کورنگی، کراچی، عبدالرشید اعوان، کنزی پارک، تھر پارکر، محمد ظفراللہ ضیا، کمالیہ، عمر مختار تارڑ، وزیرآباد، گجرانوالہ، ظفر اقبال، ریلوے کالونی، سرگودھا۔ عبداللہ خان آفریدی، شاہ فیصل کالونی، کراچی، مقبول حسین بنگش، پارہ چنار، کرم ایجنسی، محمد ضیاالدین بلال کالونی، ساہیوال یما عروج صدیقی، ناظم آباد، کراچی، عظمیٰ منیر، کوچہ پریم نگر، اٹک کینٹ، نصرت اظہر، آزاد کشمیر، روبینہ حکیم الدین پاک گیٹ، ملتان، سید سہیل بن مفرح، گجو خان روڈ، مردان، سمیرا عبدالعزیز لاہور، حمیرہ ناز غوری لاڑکانہ،

سیرتِ طیبہ پر مضامین ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

فوزیہ عزیز رانا، اسلام آباد، محمد امان اللہ خان، تانگہ اسٹینڈ، پرانا سکھر، قیصر امام میرانی، والس روڈ، سکھر، عدنان ناصر زیدی، سیمنٹ ورکس، روہڑی، پاکیزہ فاروقی، گورنمنٹ ڈگری کالج روڈ، راولپنڈی، سید شان الحق، ڈیگری، پشاور نفیسہ عبدالعزیز، جہانگیر روڈ، کراچی، پرویز خان اشرف، رانگیواڑہ، کراچی، فرزانہ انجم، ٹڈو عیدن، راحیلہ تسلیم، نواں شہر، ملتان

شبینہ بانو، اورنگی ٹاؤن، کراچی، عمران حیدر، فیڈرل کیپٹیل ایریا، کراچی، نذر حسین، ریلوے کالونی، کراچی، تکیل احمد، جمرود خیبر ایجنسی، رفعت اللہ، ملیر ہالٹ کراچی، عمران جمیل، پی آئی بی، کالونی مصباح حیات، ضلع وہاڑی، راشدہ محبوب ناظم آباد، کراچی، مشتاق احمد پراچہ، نارتھ ناظم آباد، کراچی، عامر رضا، نامعلوم، مرید علی جونیجو، نامعلوم، محمد ندیم ٹاک، کورنگی، کراچی عنبرین زہرا، سمینٹ فیکٹری، روہڑی، مہراللہ درانی، میزان مارکیٹ، کوئٹہ، احسن مشتاق پراچہ، نارتھ ناظم آباد، کراچی سید قاسم علی، بلال گنج، ساہیوال، محمد نعمان، میانی روڈ، سکھر، آصف مسعود علیخان، گمی گجوانی، روہڑی، محمد سلیم، روہڑی سمینٹ ورکس، روہڑی، ثمیر الطفیل۔ لیاقت آباد، نواب شاہ، عابد حسین، پنڈ دادنخان جہلم، شہباز سلیم، اسلام آباد، قربان علیشاہ، دستگیر، کراچی، شفیق الرحمٰن کھاکھی، شیلائٹ ٹاؤن، بہاولپور، عاصم جاوید، رحمٰن پورہ، مجیب الرحمٰن کھاکھی، شیلائٹ ٹاؤن، بہاولپور، ملک منیر احمد، ہارون روڈ ہارون آباد، محمد رمضان تبسّم، میانوالی، وقاص اُمید، مدینہ ٹاؤن فیصل آباد، محمد نعیم کورنگی، کراچی، سہیل انجم ڈار، جلالپور جٹاں، گجرات، عظمٰی رحمٰن، فیڈرل بی ایریا کراچی، فرحانہ، نامعلوم، غلام شبیر، واپڈا کالونی، میانوالی، امتیاز احمد خان، ملیر ہالٹ، کراچی، گل شیر علی، بازہ گیٹ، پشاور، فرخ نسیم، کنری پاک، تھرپارکر محمد عابد علی خان، آصف کالونی، کراچی، خالدہ شیخ، نیو سکھر، محمد صدیق الحسنات، ماڈل کالونی، کراچی، فرح ناز، کورنگی، کراچی سعید احمد، اسلام آباد، فاطمہ عبداللہ، حیدر علی روڈ، کراچی، عارف اکرم، صرافہ بازار، گجرات، تنویر آفتاب، دولت گیٹ، ملتان محمد فہیم سلطانی، سندھی ہوٹل، کراچی، عبدالقیوم، فیصل آباد، صائمہ بیگم، نوشہرہ، امان گڑھ، ملکہ مجید، پشاور، حمیرا یامین کنری پاک تھرپارکر، معراج فاطمہ، بنارس کالونی، نادیہ مصطفٰے، جناح کالونی، فیصل آباد، افزا منوّر، جلالپور جٹاں، گجرات ریحانہ کوثر، افغان آباد، فیصل آباد، شفقت علی، ٹیپو بازار، گجرانوالہ، اصغر علی، لیاری، کراچی، سارہ بخاری، نامعلوم، شگفتہ عزیز ملیر، کراچی، محمد موسٰی سومرو، شیلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ، دردانہ بنتِ غازی، سکھر، سید ظفر امام ساجد، نامعلوم، فوزیہ سردار، کورنگی کراچی، محمد اعجاز، سکھر، ماہر علی احمد، آدم ٹاؤن کراچی، سیماب نورین، لائنز ایریا کراچی، اینلا عمر، گلبرگ، کراچی ملک شہزاد ظفر، گکھڑ منڈی، گجرانوالہ، بشیر احمد کھتری، ٹنڈو محمد خان، حیدر آباد، نعمان اقبال، قصہ خوانی، پشاور، رفاقت اللہ لاہوری گیٹ چنیوٹ، سید سہیل احمد، گلبہار، کراچی، یاسمین، گلشن اقبال، کراچی، محمد مظہر ہاشمی، شالیمار ٹاؤن، لاہور محمد آصف عبدالرؤف، رامسوامی، کراچی، آصف محمود، کاہنہ نو۔ لاہور، محمد نسیم انصاری، منگھوپیر روڈ، کراچی، محمد وحید نسیم سادیہ عالم، سید پوری گیٹ، راولپنڈی، شمائلہ خانم ملیسی۔ وہاڑی، ملک جاوید اقبال، ڈھوک منگٹال، راولپنڈی، محمد جاوید عالمگیر روڈ، کراچی، محمد اشرف باتھ آئیلینڈ، کراچی، ماہین مبشّر، ناگن چورنگی، کراچی، ذیشان بن صفدر، اورنگی، کراچی سید کاشان جعفری، اورنگی، کراچی، صدف اشفاق، گلشن اقبال، کراچی، خالد سرور، نئی آبادی، کراچی، عائشہ محمد عیسٰی مارکیٹ روڈ۔ ثمرین بنیاد علی، لطیف آباد، حیدر آباد، محمد طارق تقلینی، لیاقت آباد، کراچی، ارم شفیع، فیڈرل بی ایریا، کراچی صبوحی بانو، ملیر کوثر ٹاؤن، کراچی، شیریں ارشد، مین بازار چکوال، کرن مسعود، فیڈرل بی ایریا، کراچی عبدالقدیر، فیصل آباد،

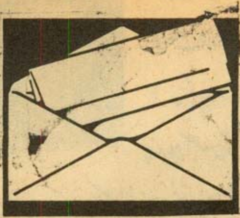

آؤ ملائیں ہاتھ

محمد عمر فاروق، گیارہ سال
جماعت ششم، مشغلہ کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر پائیلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو
مکان نمبر ۲۳۳ پی. اسٹریٹ نمبر ۶ گوبندہ پور فیصل آباد

سعید احمد، پندرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کہانیاں پڑھنا
بڑے ہوکر فوجی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگلش
مکان نمبر ۳-۲ سیکٹر ایل/۸ اورنگی ٹاؤن، ——— کراچی

سیف الرحمٰن، گیارہ سال
جماعت ششم، مشغلہ ماڈل وغیرہ بنانا
بڑے ہوکر کرکٹر بننا چاہتا ہوں.
پسندیدہ مضمون، حساب
مکان نمبر ۲۳۳ پی اسٹریٹ نمبر ۶ گو بندہ پور فیصل آباد

قیصر عباس عباسی، سولہ سال
جماعت دہم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہوکر انجنیئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، فزکس
ذاکر جنرل اسٹور، مین بازار جھاوریاں، ضلع سرگودھا.

غلام اصغر، سولہ سال
جماعت دہم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہوکر انجنیئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، فزکس
ڈاکخانہ و بمقام باہووال تحصیل پھالیہ، ضلع گجرات

انور عابد، بارہ سال
جماعت پنجم، مشغلہ، فٹبال کھیلنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو
گورنمنٹ ہائی سکول آبسر، تربت، ——— بلوچستان

محمد قمر الحسن، تیرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، پودے لگانا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، ریاضی
ولد میاں دوست محمد نزد عمر کالونی، کنڈیاں، ضلع میانوالی.

محمد قمر سعید، تیرہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، ہاکی کھیلنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں.
پسندیدہ مضمون، عربی
مکان نمبر ۴ بلاک زیڈ، گلی نمبر ۹ مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

محمد شاکر ، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہو کر سائنسدان بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، کیمسٹری
مکان نمبر ۱۸۵/ ایل سیکٹر / بی / ۵ ، نیو آبادی نیو کراچی

رضوان حنفی ، گیارہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، ٹکٹ جمع کرنا
بڑے ہو کر پائیلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، حساب
۱۳ ـ رحمان منزل ، مسلم ٹاؤن ـ لاہور ۱۶

عمران نوشاد ، بارہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر فوجی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، سائنس
آشیانہ العمران ، تحصیل روڈ ، ہری پور ، ہزارہ

عبدالغفار بلوچ ، تیرہ سال
جماعت ہفتم ، مشغلہ ، رسائل پڑھنا
بڑے ہو کر پائیلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، انگلش
ماسٹر امام بخش میموریل لائبریری ، ملیر ، کراچی ۴۳

محمد شفیق ، سولہ سال
جماعت دہم ، مشغلہ ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر انجنیئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، انگلش
روہڑی سیمنٹ ورکس ہائی اسکول ، روہڑی ، ضلع سکھر

مصطفےٰ جمیل ، تیرہ سال
جماعت ہفتم ، مشغلہ ، رسالے پڑھنا
بڑے ہو کر بنک آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، ریاضی
روم نمبر ۱۷ ، عثمان منشن تعمیری منزل ، جی الانہ روڈ ، کھارادر کراچی

رضوان احمد خان ، بارہ سال
جماعت ہفتم ، مشغلہ ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، حساب
۹/۱۳ بی ون ایریا ، لیاقت آباد ، کراچی ۱۹

حسین مہدی ، گیارہ سال
جماعت ہفتم ، مشغلہ ، فٹبال کھیلنا
بڑے ہو کر انجنیئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، ریاضی
۴/۱ سو کوارٹرز ، حسین آباد ، گلبہار ، کراچی ۱۸

حنیف انور ، بارہ سال
جماعت ہفتم ، مشغلہ ، وڈیو کھیلنا
بڑے ہو کر بزنس مین بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، اردو
مکان نمبر ۴/۱۹۱ لیاقت آباد ، کراچی نمبر ۱۹

سید نعمان احمد ، چودہ سال
جماعت نہم ، مشغلہ ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر سائنسدان بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، اردو
بی ۱۹/۱۱ لطیف آباد یونٹ نمبر ۵ ، حیدر آباد

عبداللہ آفریدی ، سولہ سال ،
جماعت ہشتم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہوکر پروفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اسلامیات،
شاہ فیصل کالونی، بلدیہ ٹاؤن، مہاجر کیمپ، کراچی

عفران علی قریشی ، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کتب پڑھنا
بڑے ہوکر سائنسدان بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، کیمسٹری،
اے ۵/۵۱۰-۳۰-بی نصرت کالونی نمبر ۳ میانی روڈ سکھر

توصیف دلاور، تیرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، لکھنا پڑھنا
بڑے ہوکر بزنس مین بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
دوسری منزل، امین برادرز بلڈنگ جی الانہ روڈ کھارادر، کراچی

محمد ہارون ، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہوکر کرکٹر بننا چاہتا ہوں۔
پسندیدہ مضمون ، انگریزی
مکان نمبر ۹۰۴۳ میمن محلہ، ٹنڈو آدم ضلع سانگھڑ

جاوید اقبال ، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، اسکاؤٹنگ
بڑے ہوکر اسکاوٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، فزکس
منصبدار خان دکاندار، مین بازار، کھوڑ، ضلع اٹک

شبیر احمد چاچڑ ، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر انجنیئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون ، سندھی
گورنمنٹ ہائی اسکول کشمور ، ــــــ ضلع جیکب آباد

- قلمی دوستی کے اس کالم میں صرف اسکول کے طلبہ و طالبات شریک ہو سکتے ہیں۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا۔
- خراب اور نامکمل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے۔
- طالبات قلمی دوستی کے لئے اپنی تصاویر نہ بھیجیں۔

نام ــــــــ عمر ــــــــ جماعت ــــــــ
مشاغل ــــــــ اسکول میں پسندیدہ مضمون ــــــــ
بڑے ہوکر کیا بننا چاہتے ہیں ــــــــ وجہ ــــــــ
پتہ ــــــــ

امّی ابّو کا صفحہ

بچوں کی تفریح کا پسندیدہ ترین سامان ہے۔ ہر دوسرے گھر میں ٹیلیویژن پہنچ چکا ہے اور جن گھروں میں ٹیلیویژن نہیں تھا۔ وہاں بچوں ہی کے پُرزور اصرار و فرمائش پہ اب ٹیلیویژن خریدا جا چکا ہے۔ اکثر والدین ٹیلیویژن سیٹ سے اپنا ڈرائنگ روم یا ٹی وی لاؤنج سجا کر بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اور ٹیلیویژن شام سے شروع ہوتا ہے تو فرمانِ الٰہی کے وقت ہی بند ہوتا ہے۔ بڑے اپنی دلچسپی کے لئے ٹی وی آن کرتے ہیں اور اس سے فائدہ بچے اٹھاتے ہیں اور خود بھی ٹی وی کے سامنے براجمان ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات انہیں ایسا کرنے کا پورا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رات کا وہ حصّہ جس میں بچوں کو لکھنا پڑھنا چاہیئے وہ بھی ٹی وی کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور اب تو وی سی آر کی وبا بھی پھیل چکی ہے جو ٹی وی سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ تعلیم سے بچوں کی بے توجہی بالآخر امتحانات کے بعد رنگ لاتی ہے جب وہ فیل ہو جاتے ہیں یا جیسے تیسے پاس ہو جاتے ہیں جس سے نہ انہیں خوشی ہوتی ہے نہ گھر والوں کو۔ والدین اس وقت تمام ذمہ داری بچے پر ڈال کر خود علیٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ غالباً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کو کسی تعلیمی ادارے میں داخل کرا کے یا کسی ٹیچر کی ٹیوشن دلا کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں اور اب یہ بچے کی ذمّہ داری ہے کہ وہ محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کرے۔ یہ خیال نہایت خام اور یہ تصوّر نہایت ناقص ہے۔ والدین کا فرض یہ بھی ہے کہ بچے کو لکھنے پڑھنے کے لئے گھر میں ایک سازگار فضا فراہم کریں ایسے گھر میں جہاں چھ سے آٹھ گھنٹے تک ٹی وی اسکرین روشن رہے اور جس کی آواز پورے گھر میں گونجتی رہے وہاں ناپختہ ذہن کا بچہ تو چھوڑیئے پختہ عمر کا آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گھر کے ماحول میں ایک ڈسپلن قائم کرنا بیحد ضروری ہے۔ اور اس ڈسپلن کے تحت بچوں کو پابند کیا جانا چاہیئے کہ وہ ایک خاص وقت تک اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔ ہر وقت یا موقع بے موقع ٹی وی آن کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ جواز۔ اس سلسلے میں والدین اگر خود اپنے اوپر بعض پابندیاں عائد کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بچے اس کی تقلید نہ کریں۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسے گھروں میں جہاں ٹی وی ایک ڈسپلن کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ وہاں کے بچے تعلیمی میدان میں ان بچوں سے بہر حال بہتر نظر آتے ہیں جہاں ٹی وی کو کسی نظم و ضبط کے تابع نہیں کیا گیا ہے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس طرح ٹی وی کے ان اثرات سے بچوں کو محفوظ کیا جاسکتا ہے جن کے سلسلے میں ماہرینِ ابلاغ اپنی تشویش ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

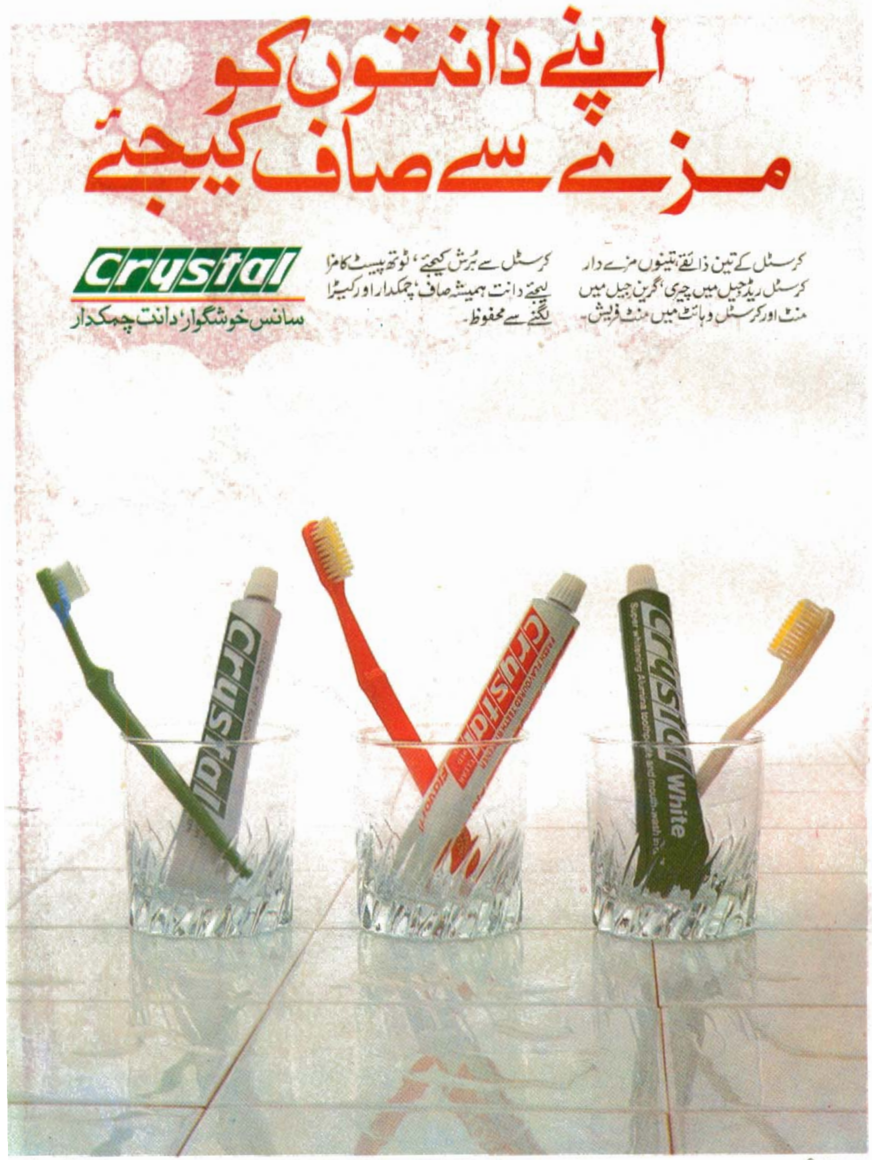

Interflow APL 100

Scanner

Regd. No. M-266 JANUARY 1988

Monthly AANKH MICHOLEE Karachi